بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ محرمانہ

حدیث خود نوشت اور حدیث دیگراں پر مشتمل
مصنف کی شخصیت اور فکر و فن پر منتخب نگارشات

منصور عاقل

مکتبہ اتحاد المصنفین پوسٹ بکس نمبر ۲۸۳۹
اسلام آباد (پاکستان)

نام کتاب	حرفِ محرمانہ
مصنف	سید منصور عاقل
سال اشاعت	مئی ۱۹۹۴ء
مطبع	منزہ پرنٹرز اسلام آباد
سرورق	امجد شہزاد
قیمت	

ناشر

مکتبہ اتحاد المصنفین پوسٹ بکس نمبر ۲۸۳۹

اسلام آباد (پاکستان)

مصنف

انتساب

والد مرحوم قاضی سید حبیب اللہؒ کے نام
جن کے مذاق علمی نے میری شخصیت کی تعمیر
اور فکروفن کے ارتقاء میں بنیادی کردار ادا کیا

منصور عاقل ----------

ہر ایک عنوان درد فرقت ہے ابتدا شرح مدعا کی
کوئی بتاؤ کہ یہ فسانہ سنائیں ان کو کہاں سے پہلے

حصہ اول

حدیث خود نوشت

حصہ دوئم

حدیث دیگراں

حوالہ	عنوان	راقم	صفحہ
خیال اکیڈمی لیہ (پاکستان) ۳۱ دسمبر ۱۹۹۳ء	منصور عاقل کا گہوارۂ سخن	ڈاکٹر خیال امروہوی	۸۷
نشریہ ریڈیو پاکستان اسلام آباد ۲۵ نومبر ۱۹۹۳ء	گہوارۂ سخن	ڈاکٹر محمد معزالدین	۹۳
فیملی میگزین لاہور (یکے از مطبوعات نوائے وقت) ۱۹ تا ۲۵ اپریل ۱۹۹۴ء	سید منصور عاقل کے کلام اور شخصیت کے چند پہلو	شریف فاروق	۱۰۰
"بہاولپور میں اردو" مولفہ مسعود حسن شہاب شائع کردہ اردو اکیڈمی بہاولپور ۱۹۸۳ء	منصور عاقل	مسعود حسن شہاب	۱۰۸

حوالہ	عنوان	راقم	صفحہ
"مشاہیر بہاولپور" مولفہ مسعود حسن شہاب شائع کردہ مکتبہ الہام بہاولپور ۱۹۸۱ء	منصور عاقل	مسعود حسن شہاب	۱۱۱
"ضیائے سخن" مجلّہ خصوصی کسٹمز پریوینٹو سروس کلب کراچی ۱۹۷۴ء	قطعہ	راغب مراد آبادی	۱۱۴
۱۵ مئی ۱۹۷۳ء	خدا حافظ	سید فیضی	۱۱۵
۱۹۷۲ء	نذرعقیدت	قمر صدیقی	۱۱۷
"بہاولپور کا شعری ادب" مرتبہ حیات میرٹھی شائع کردہ اردو اکیڈمی بہاولپور ۱۹۷۱ء	سید منصور عاقل	حیات میرٹھی	۱۱۹
ہفت روزہ "مدینہ" بہاولپور ۱۲ اگست ۱۹۶۶ء	سید منصور عاقل	منظور احمد رحمت	۱۲۵
۲۱ جنوری ۱۹۶۵ء	نذر منصور	شمیم بھیروی	۱۲۷

حوالہ	عنوان	راقم	صفحہ
"دبستان بہاولپور" مصنفہ ماجد قریشی (ایم-اے) مطبوعہ ادارہ آفتاب مشرق بہاولپور ۱۹۶۴ء	منصور عاقل	ماجد قریشی	۱۲۸
۲۸ جون ۱۹۶۴ء	الوداع	خلیق قریشی	۱۳۹
"دبستان بہاولپور" مصنفہ ماجد قریشی ایم-اے مطبوعہ ادارہ آفتاب مشرق بہاولپور ۱۹۶۴ء	نیشنل یوتھ کونسل	ماجد قریشی	۱۴۱
روزنامہ عوام لائلپور ۲۸ جون ۱۹۶۴ء ہفت روزہ مدینہ بہاولپور ۳ جولائی ۱۹۶۴ء ہفت روزہ پاکستانی لائلپور ۱۰ جولائی ۱۹۶۴ء	سید منصور عاقل	خلیق قریشی	۱۴۴
روزنامہ ملت لائلپور ۲۴ جون ۱۹۶۴ء	خدمات کا اعتراف	سردار عبدالعلیم	۱۴۷
سہ روزہ "زمزم" بہاولپور (خاص نمبر) یکم جون ۱۹۵۷ء	منصور عاقل	منظور احمد رحمت	۱۴۸

حوالہ	عنوان	راقم	صفحہ
ہفت روزہ "الہام" بہاولپور (حلقہ ارباب ادب نمبر) ۷ جون ۱۹۵۵ء	مینارے	ادیب واشقی	۱۴۹
ہفت روزہ انصاف بہاولپور ۱۲ مئی ۱۹۵۴ء	منصور عاقل	ادارہ	۱۵۳

حصہ اول

حدیث خودنوشت

عبارت ہے انہیں کے دم سے میرا ہر نفس عاقل
یہ سب انکی حکایت ہے کہانی ہے کہاں میری

-------------- منصور عاقل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منصور عاقل

بقلم خود

ماضی کا شعور جب بیدار ہوتا ہے تو ہر ادنیٰ سے ادنیٰ واقعہ بھی ذہن کی سطح پر ستارے کی طرح جھلملانے لگتا ہے بھولی بسری باتیں تاریخ کا روپ دھار لیتی ہیں اور گذشتہ سے پیوستہ ہو جانے کا احساس حال اور مستقبل دونوں کو لازوال بنا دیتا ہے۔ ایسی ہی کیفیات میں اکثر انسان خود کو ٹٹولنے کے نفسیاتی تجربہ سے بھی دوچار ہوتا ہے اور اسے اپنی ذات کے آئینہ میں بے شمار ایسے عکس بھی نظر آتے ہیں جن کے حوالے سے وہ اپنی شخصیت کے تمام نشیب و فراز صاف صاف دیکھ سکتا ہے۔

چنانچہ زیر نظر تحریروں کی تدوین کے وقت میں خود بھی ایسی ہی کیفیات سے دوچار ہوں اور اپنے بارے میں دوسرے حضرات کی آراء پیش کرتے ہوئے ایک عجیب سا احساس دامن گیر ہے۔ مجھے اپنے بارے میں نہ صرف یہ کہ کوئی خوش فہمی نہیں ہے بلکہ ماحول تجربات اور رفاقتوں کے فیضان کی حقیقتوں کا ادراک گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ اتنا ہی شدید ہے جتنا کہ اپنی بے بضاعتی کا احساس-----

جمال ہم نشیں درمن اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

مجھے نہ تو اپنی محرومیوں کا گلہ ہے اور نہ اپنی کامرانیوں پر فخر بلکہ مجھے زندگی میں جو کچھ حاصل ہوا ہے اسے اللہ تعالیٰ کا کرم سمجھتا ہوں اور مشکلات سے نمٹنے کا جو حوصلہ پیدا ہوا وہ بھی پروردگار ہی کی دین ہے۔ میرے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ یقیناً" خلوص نیت پر مبنی ہے اور نہ جانے مجھے یہ موقع کس طرح میسر آگیا کہ اخباروں کتابوں اور رسائل کے ہجوم سے میں یہ بکھرے ہوئے اوراق مجتمع کر سکا ہوں بہرحال یہ بھی انہیں دوستوں کی محبت کا اعجاز ہے جنھوں نے مجھ جیسے حقیر انسان کو اپنی گرانقدر تحریروں کا موضوع قرار دیا۔

شعر و ادب سے میری وابستگی ہمیشہ طالب علمانہ بلکہ والہانہ رہی اور خدا کا شکر ہے کہ اس وابستگی نے کبھی پیشہ وارانہ حیثیت اختیار نہ کی ویسے بھی میرے ادبی میلانات میری کسی اکتسابی صلاحیت کے اتنے مرہون منت نہیں جتنا کہ ماحول اور بزرگوں کے فیضان کا نتیجہ ہیں میری والدہ مرحومہ سیدہ تمکینہ فاطمہ نہ صرف بلند پایہ ادبی ذوق کی مالک تھیں بلکہ ایک ذہین ادیبہ اور باصلاحیت شاعرہ بھی تھیں اور بچپن ہی سے ان کی شخصیت کے یہ رخ میرا ذہنی اور روحانی ورثہ بنتے چلے گئے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی عالی حوصلگی۔ معاملہ فہمی۔ مدبرانہ حکمت عملی۔ قائدانہ صلاحیت اور سب سے بڑھ کر ان کی خود دار طبیعت اور متانت و حلم سے جو کچھ بھی بطور ترکہ مجھے میسر آیا وہ ہمیشہ میرے لیے باعث عزت و افتخار ثابت ہوا۔

میری خوش بختی یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ میری اس حقیر سی زندگی میں حصول علم کی لگن نے جو کچھ بھی ارتعاش پیدا کیا ہے وہ ایک حد تک میرے والد بزرگوار قاضی سید حبیب اللہ مرحوم و مغفور کا فیضان ہے۔ وہ اور میری والدہ دونوں ہی راسخ العقیدہ مذہبی ذہن رکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ ہم بہن بھائیوں کی تعلیم و تربیت میں مذہبی ماحول کی اثر پذیری ہمیشہ نمایاں رہی۔ والد صاحب کو مختلف علوم سے بے پناہ شغف تھا اور کثرت مطالعہ ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی مجھے یاد ہے کہ ہمارے گھر میں جو ہمارا سب سے واضح اثاثہ نظر آتا تھا وہ والد صاحب کا عظیم الشان ذخیرہ کتب تھا جس میں بیشمار اردو فارسی' عربی' انگریزی' ہندی اور سنسکرت کی مطبوعہ کتب کے علاوہ لاتعداد قلمی نسخے اور فرامین شاہی شامل تھے۔ کاش مجھے اس زبردست

ذخیرہ علمی کا اس وقت شعور ہوتا اور میں اس سے استفادہ کی سعادت حاصل کرتا۔ اب ☆ جبکہ میں پنجاب آرکائیوز کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے خود حکومت کے ایک بہت بڑے ذخیرہ علمی و تاریخی کی داشت و پرداخت پر مامور ہوں میرا احساس محرومی اور بھی شدید ہو گیا ہے۔

جنوری ۱۹۴۸ء میں جب میں اپنی والدہ محترمہ بڑے بھائی علامہ سید قابل اور بہنوں کے ہمراہ پاکستان آیا تو نویں جماعت کا طالب علم تھا والد صاحب نے پاکستان کے لیے اپنی روانگی غالباً" اس لیے موخر کر دی تھی کہ وہ اس ذخیرہ کتب کو کسی طور اپنے ساتھ لانا چاہتے تھے لیکن چند ماہ بعد جب وہ لاہور پہنچے تو اس ذخیرہ سے محرومی کا صدمہ اپنے ساتھ لائے۔ صحت دن بدن گرتی گئی اور ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائد اعظم کی رحلت نے زندہ رہنے کا رہا سہا حوصلہ بھی چھین لیا۔ چنانچہ ٹھیک ایک ہفتہ بعد یعنی ۱۸ ستمبر ۱۹۴۸ء کو خود بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

یہیں سے میری زندگی ایک ایسے دور میں داخل ہوتی ہے جس میں میرا واحد سہارا اللہ تعالٰی کی ذات پر غیر متزلزل ایمان ہے اور پے بہ پے مسائل و مصائب سے نبرد آزما ہونے کے لیے اس تربیت کی ڈھال جو میرے والدین کا عطیہ تھی اور جس نے مجھے گمراہیوں کے خلاف بھی زبردست قوت مدافعت عطا کی۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد لاہور میں حالات سازگار نہ رہے۔ چنانچہ والدہ مرحومہ میری دونوں بہنوں اور بڑے بھائی سید منظور عادل کے ہمراہ جو شادی شدہ تھے بہاولپور منتقل ہو گئیں جہاں میرے سب سے بڑے بھائی علامہ سید قابل کی کاوشوں کے نتیجہ میں سکونت کے اسباب میسر آئے میں نے اپنی والدہ کی اجازت بلکہ ایماء پر لاہور ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا تاکہ میٹرک کے بعد مزید تعلیم جاری رکھ سکوں جو بیک وقت "چکی کی مشقت" کے بغیر ممکن نظر نہیں آتی تھی البتہ خوش قسمتی سے "مشق سخن" جاری رکھنے کے لیے بھی سازگار ماحول میسر آ گیا۔

☆ یہ سطور جس وقت تحریر کی گئیں اس وقت راقم الحروف حکومت پنجاب میں تعینات تھا۔ (۸۳-۱۹۸۰ء)

دیال سنگھ کالج

دیال سنگھ کالج لاہور میں سال اول کے طالبعلم کی حیثیت سے ایک دلچسپ واقعہ میرے ساتھ پیش آیا جسے میں اپنے علمی وادبی ذہن کی تشکیل میں ابتدائی محرکات میں سے ایک اہم محرک تصور کرتا ہوں کالج کی لائبریری سے "شعرالہند" کی پہلی جلد میں نے اپنے نام جاری کرائی لیکن یہ کتاب مقررہ وقت سے کہیں زیادہ میرے پاس رہی چنانچہ حسب قاعدہ جرمانہ عائد کر دیا گیا جسے معاف کرانے کے لیے میں پرنسپل سید عابد علی عابد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ یہ سن کر کہ میں سال اول کا طالبعلم ہوں اور میں نے لائبریری سے "شعرالہند" اپنے نام جاری کرائی سخت برہم ہوئے جرمانہ معاف کرنا تو کجا انہوں نے مجھے ڈانٹ کر اپنے کمرہ سے باہر نکال دیا جس پر مجھے سخت توہین کا احساس ہوا فوراً" بعد ہی انہوں نے لائبریرین فاطمی صاحب کو بلایا جنہوں نے واپس آتے ہی وہ کتاب مجھ سے لے لی چنانچہ مجھے یہ تاثر ملا کہ سال اول کے طالبعلم کی حیثیت سے یہ کتاب میرے معیار سے بہت بلند ہے اور لائبریری کو ایسی کتب ابتدائی سالوں کے طالب علموں کو ہرگز جاری نہیں کرنی چاہئے۔ مجھے اس واقعہ کا سخت ملال رہا۔ اتفاق سے چند ہی دن بعد کالج میں ایک ادبی مذاکرہ بعنوان "تخیل اور تخیلی عمل" منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر شریف (مرحوم) نے کی۔ طلباء کی صفوں میں، میں بھی موجود تھا۔

دوران مذاکرہ طلباء کو بھی اظہار خیال کی دعوت دی گئی میں نے اس موضوع پر زبردست تیاری کی تھی چنانچہ موقع ہاتھ آگیا اور میں نے اظہار خیال کے دوران اپنے موقف کی وضاحت کے لیے جہاں حافظ وسعدی۔ عرفی ونظیری اور غالب و اقبال کے کلام سے مثالیں پیش کیں وہاں جناب عابد علی عابد ڈاکٹر تاثیر، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور بعض دیگر حاضرین کے کلام سے بھی حوالے دیئے میری گفتگو کا اثر صاف محسوس ہو رہا تھا۔ چنانچہ اگلے ہی روز میں فلسفہ کی کلاس میں تھا کہ پرنسپل کا چپڑاسی مجھے بلانے آگیا اور عابد صاحب سے میری یہ دوسری ملاقات بالکل مختلف ثابت

ہوئی ان کی حوصلہ افزائی کا یہ نتیجہ نکلا کہ میں کالج سے باہر بھی لاہور کی ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لینے لگا۔

لیکن یہ سب کچھ فکر معاش کے تقاضے پورے کیے بغیر ممکن نہ تھا اور مجھے احساس تھا کہ میری والدہ مرحومہ نے میرے لیے بہت بڑی قربانی دی تھی انہیں والد صاحب کے انتقال کے بعد معاشی سہارے کی ضرورت تھی یہ سہارا میرے میٹرک کرنے کے فوراً" بعد انہیں میرے ملازمت اختیار کر لینے کی صورت میں ایک حد تک میسر آسکتا تھا چنانچہ اس مرحلہ پر میں سابق ریاست بہاولپور کے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جس کے نتیجہ میں مجھے اور میرے اہل خانہ کو قناعت میں راحت میسر آئی اور اللہ کا شکر ہے کہ میری والدہ کی خود داری حالات کی نامساعدت کے باوجود کبھی مجروح نہ ہوئی مجھے ہر سال موسم گرما کی تعطیلات میں ریاست میں ملازمت مل جاتی - بلکہ بی' اے کے دونوں سالوں میں مجھے امیر آف بہاولپور فنڈ سے تعلیمی وظیفہ برابر ملتا رہا۔

ادھر لاہور میں جو وسائل میسر آئے ان میں ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۳ء کے وقفوں میں روزنامہ زمیندار اور روزنامہ تسنیم سے میری بحیثیت سب ایڈیٹر وابستگی نے ادب کے ساتھ ساتھ صحافت سے میرے ذہنی رشتوں کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ مولانا ظفر علی خاں (مرحوم) اپنی ضعیفی و پیرانہ سالی کے باعث اگرچہ زمیندار کے امور سے اپنے فرزند مولانا اختر علی خان کے حق میں دستبردار ہو گئے تھے لیکن مجھے دو ایک بار انہیں ایڈیٹر کے کمرہ میں رونق افروز دیکھنے کا اتفاق ہوا اس وقت زمیندار سے جو لوگ وابستہ تھے ان میں نظیر لدھیانوی' عبدالرحیم شبلی (بی کام)' ابو ظفر نازش رضوی' ممتاز ملک اور اقبال صدیقی وغیرہ اخبار کے روح رواں تھے مجھے ان حضرات سے اپنے اداراتی تعلق کی یاد آج بھی عزیز ہے۔ تسنیم اخبار میں بھی مجھے جناب نصراللہ خاں عزیز جیسے اہل قلم اور بزرگ صحافی کی رہنمائی میسر آئی۔

اس دور میں لکھنے پڑھنے کے مشاغل بقدر ضرورت ہی نہیں بلکہ بحد اشتیاق بھی رہے اور وہ بھی اس طرح کہ کالج کی علمی و تہذیبی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ شہر کے دیگر ادبی حلقوں میں بھی کثرت سے آمد و رفت کے باعث

ماحول اور شخصیتوں سے بہت کچھ اکتساب فیض کیا۔ مولانا صلاح الدین احمد (مرحوم) جیسے صاحب طرز انشاء پرداز کو حلقہ ارباب ذوق کی نشستوں میں متعدد بار سنا اور حلقہ ارباب علم میں مرحوم آغا شورش کاشمیری اور آغا بیدار بخت کی "دھواں دھار" تنقیدیں سنیں اور ان میں شرکت کی اس کے علاوہ گھر پر بھی میرا ماحول باہر سے کچھ مختلف نہ تھا کیونکہ میں اور میرے رفیق سید مظفر ضیاء شریک رہائش بھی رہے۔ وہ اسلامیہ کالج میں پڑھتے تھے اور مجھ سے دو سال سینئیر تھے۔ ان کا اوڑھنا بچھونا بھی ادبی مشاغل ہی تھے اور نجی حالات کی کم و بیش مماثلت اور ادبی ذہن کی یکسانیت نے ہماری دوستی کو شانہ بشانہ اور قدم بہ قدم پروان چڑھایا۔ چنانچہ گھر پر بھی اکثر ادبی دوستوں ہی کی محفلیں گرم رہتیں بلکہ ان میں میرے بڑے بھائی علامہ سید قابل کی آمد سے اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ قابل بھائی جوان دنوں اپنے اہل وعیال کے ساتھ پشاور میں سکونت اختیار کر چکے تھے اکثر لاہور آتے اور میرے ہی پاس قیام کرتے۔ اس دور میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ قابل صاحب بے پناہ ذہانت و صلاحیت کے مالک ہیں۔ بچپن میں میں نے انکی زیرکی اور قابلیت کے چرچے سنے تھے وہ تقسیم ملک سے قبل برصغیر کی سطح پر ایک نامور صحافی ادیب اور شاعر کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے اور دہلی میں وحدت' وطن' الامان اور دیگر اخبارات و رسائل کے مختلف اوقات میں مدیر رہے۔ شاعری میں میرے نانا مولانا سید عبدالوحید فدا (مرحوم) سے شرف تلمذ حاصل کیا جو نواب مرزا داغ دہلوی کے شاگردان خاص میں سے تھے اور جن کی قادر الکلامی کا شہرہ ایک مدت تک برصغیر میں رہا اصل میں میری والدہ (مرحومہ) میں بھی شعر و ادب کی جو صلاحیتیں تھیں وہ اپنے والد ہی کا ورثہ تھیں۔

قابل بھائی کی ان دنوں لاہور میں آمد ورفت سے ان کی صلاحیتیں ہی مجھ پر منکشف نہیں ہوئیں بلکہ ان کے شعری رجحانات سے بھی میں نے اثر قبول کیا میں ہی نہیں میرے احباب بھی ان کی انگریزی' فارسی' اردو اور ایک حد تک عربی میں دسترس سے متاثر تھے۔ قابل بھائی خصوصاً" انگریزی اور فارسی میں علمی موضوعات پر نہایت روانی سے گفتگو کرتے اور ہم محو حیرت بنے ان کو دیکھا کرتے یہی نہیں بلکہ بیشمار لوگ جو انہیں جانتے ہیں ان کی فارسی اور اردو شاعری میں ضرب المثل بدیہہ گوئی کے

معترف ہیں اور پیرانہ سالی کے باوجود اب ☆ بھی انکی ذہنی توانائی کا یہ عالم ہے کہ وہ تقریباً سو پچاس شعر ہر روز علی الصبح کہہ لیتے ہیں۔ مگر افسوس کہ وہ خود اپنی بے پناہ ذہانت کے ہاتھوں خسارے میں رہے اور اپنے کیریئر کی سمت کا تعین نہ کر سکے۔

"اے روشنی طبع تو برمن بلاشدی"

لاہور کے قیام میں مجھے ادبی موضوعات پر مطالعہ کا جس قدر موقع ملا اتنا بعد میں کبھی میسر نہ آیا اور سچ تو یہ ہے کہ حافظہ کی گرفت آج بھی اس دور کے مطالعہ پر نسبتاً بہتر ہے میں نے انہیں دنوں اردو شاعری کے ارتقائی ادوار کا تفصیلی مطالعہ کیا اور قریب و بعید کے شعراء کا ایک عہد وار انتخاب بڑی محنت سے تیار کیا جو بعد میں اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ہر مرحلہ پر میرے بہت کام آیا اگر وقت نے مہلت دی تو انشاء اللہ نثری جائزوں کے ساتھ اس انتخاب کو طبع کرانے کی کوشش کرونگا۔

اس مطالعہ نے میرے تخلیقی رجحانات کو بھی متاثر کیا چنانچہ ادب میں روایت کا احترام اور تجربہ کا رجحان دونوں ہی میری فکر میں اعتدال بن کر گھر کرنے لگے مجھے تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ پیار غزل سے اسی دور میں پیدا ہوا اور لاہور کے ادبی حلقوں نے جو تنقیدی شعور عطا کیا اس نے ہم عصر ادبی تحریکوں۔ تجربوں اور رجحانات سے میرا ذہنی رابطہ کبھی نہ ٹوٹنے دیا۔

بہاولپور کا قیام

بہاولپور سے میرا تعلق ۱۹۵۳ء کے آخر سے زیادہ قریب ہوتا گیا اور یہ ربط

☆ افسوس کہ یہ مسودہ ابھی مکمل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ قابل بھائی ۶ جولائی ۱۹۸۲ء کو مختصر علالت کے بعد واہ کینٹ میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

و ضبط کم و بیش ڈھائی تین سال خاصا بھرپور رہا۔ اس مدت میں مجھے ریاست کے محکمہ اطلاعات اور محکمہ تعلیمات سے وابستہ رہنے کا بھی موقع ملا اور وہاں کی معاشرتی، تہذیبی اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی سعادت بھی ملی ۱۹۵۳ء ہی کے آخر میں وہاں ایک ادبی محفل میں میں نے ایک ایسا مقالہ پڑھ دیا جس نے اس تمام علاقے میں ایک ہلچل مچا دی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ عدالتوں میں ازالہ حیثیت عرفی کے مقدمات دائر ہو گئے اور میرے خلاف بعض اخبارات میں ذاتی حملے تک کیے گئے لیکن یہ سب کچھ میری توقعات کے عین مطابق تھا اس لیے میرا ردعمل معمول کے مطابق تھا بات یہ تھی کہ بہاولپور پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ وہاں شاعری کچھ مصحفی و جرات کے عہد کی ڈگر پر چل رہی ہے مشاعرے تو خوب ہوتے ہیں لیکن ادبی انتقاد کی فضاء تقریباً" مفقود ہے جس کے نتیجہ میں لکھنے والوں کا رابطہ باہر کی تحریکوں اور نئے رجحانات سے بہت کمزور سا ہے۔ بے بصری کی اس فضا کے باوجود مجھے دو ایک ہم خیال ساتھی میسر آگئے جو اصل میں مجھ سے بھی زیادہ اس صورتحال پر کڑھ رہے تھے لیکن شاید کسی نعرہ مستانہ لگانے والے کے منتظر تھے بہر حال یہ مجنونانہ حرکت مجھ سے سرزد ہو گئی مقدمات کا تو کچھ نتیجہ نہ نکلا البتہ یہ نتیجہ ضرور برآمد ہوا کہ بہاولپور میں یکے بعد دیگرے تنقیدی حلقے قائم ہونا شروع ہو گئے جن میں ادبی تخلیقات کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیا جانے لگا نوجوان طبقہ کو اس تبدیلی سے خاص طور پر فائدہ پہنچا جو بڑھتے ہوئے عصری تقاضوں کے شعور کی صورت میں ظاہر ہونے لگا۔ مشاعروں کا رنگ ڈھنگ بھی بدلا اور محسوس ہوا کہ غزل ایک مقام پر نہیں ٹھہر گئی ہے بلکہ یہ کارواں منزل بہ منزل گرد سفر کو اپنے جلو میں لیے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس ضمن میں حلقہ ارباب ادب اور کارواں ادب دو ایسی انجمنیں ادبی افق پر ابھریں جنہوں نے واقعی بہتے ہوئے دھاروں کا رخ موڑ دیا ان میں سے حلقہ ارباب ادب سے بحیثیت موسس میری نسبت آج بھی میرے لیے باعث فخر ہے۔

اس دور کا ایک اہم واقعہ بہاولپور میں کل پاکستان اردو کانفرنس کا انعقاد ہے جسے بہاولپور کے تقریباً" تمام ہی اہل قلم حضرات اور اردو کے قدر دانوں کا تعاون حاصل تھا جن میں محی الدین شان حیات میرٹھی عبدالحق شوق، علی احمد رفعت، شہاب

دہلوی، ادیب واثقی، امجد قریشی اور تابش الوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ صحافی حضرات میں سے اردو کانفرنس ہی نہیں بلکہ ہر صحتمند ادبی تحریک میں علامہ منظور احمد رحمت نے بھرپور تعاون کیا انہوں نے اپنی رواں دواں تحریروں سے بہاولپور کے ماحول کو ہمیشہ گرمائے رکھا۔ مجھے اس کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کے میر مجلس ہونے کا شرف حاصل تھا۔ جس کی صدارت بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے فرمائی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ مغربی پاکستان میں ریاست بہاولپور کے ادغام کے فوراً بعد جو حضرات وہاں بحیثیت کمشنر تعینات ہوئے ان میں سید ہاشم رضا اور مسرت حسین زبیری جیسی علم دوست ہستیاں بھی تھیں جنکی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کے سبب بہاولپور میں علم و ادب کے ارتقاء کا عمل اور بھی تیز ہو گیا۔ میں نے انہیں دنوں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے پولیٹیکل سائنس کا امتحان پاس کیا تھا بعض اخبارات و رسائل میں میری اعزازی کامیابی کے پیش نظر خبریں بھی شائع ہوئی تھیں میں ایک روز بہاولپور ریلوے سٹیشن پر ملتان جانے کے لیے ٹرین کے انتظار میں ایک کتاب پر نظریں جمائے بیٹھا تھا کہ مجھے اپنے کاندھے پر ایک ہاتھ کی سرسراہٹ محسوس ہوئی پلٹ کر دیکھا تو سید ہاشم رضا صاحب مجھ سے مخاطب تھے۔ انہوں نے مجھے امتحان میں کامیابی پر مبارکباد دی اور دعوت دی کہ میں ان کی ذاتی لائبریری سے استفادہ کروں۔ اس ملاقات میں مجھے معلوم ہوا کہ سید صاحب نے بھی پولیٹیکل سائنس ہی میں ایم۔ اے کیا تھا۔ سید صاحب کی اس شفقت سے میری بیحد حوصلہ افزائی ہوئی بلکہ اس کے بعد انہوں نے مجھے ہمیشہ اپنی نجی محفلوں میں بھی مدعو کیا جن میں وہ یادگار شعری نشست بھی شامل ہے۔ جو ان کے دولتکدہ پر فضل احمد کریم فضلی مرحوم کے اعزاز میں منعقد ہوئی تھی جو اس وقت مرکزی حکومت میں جائنٹ سیکرٹری تھے فضلی صاحب سے اس ابتدائی تعارف کے بعد دوسری ملاقات "بڑی مشکل" میں ہوئی۔ ہوا یوں کہ میں ۱۹۵۷ء میں سول اور فارن سروس کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہوا۔ پبلک سروس کمیشن نے انٹرویو کے لیے جو پینل مقرر کیا تھا اس میں جناب فضلی بھی تھے میں جب پیش ہوا تو غالباً انہوں نے مجھے پہچان لیا اور میرے ادبی پس منظر کے حوالے سے شروع ہی میں مجھ سے ایک ایسا سوال کر دیا جس کو سن کر ایک لمحے کے لیے میں

سخت مشکل میں پڑ گیا انھوں نے میری توجہ میرے نام کی طرف دلائی اور کہا کہ لفظ منصور کے ساتھ جو روایت وابستہ ہے وہ عاقل کی معنوی حیثیت سے قطعاً" متضاد ہے آخر یہ نام رکھنے کی توجیہ کیا ہے میرے پاس حقیقت میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا لیکن معاً" میرے ذہن میں حکیم الامت مرحوم کا یہ شعر آیا کہ

باچنیں ذوق جنوں پاس گریباں داشتم
درجنوں ازخود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست

وہ یہ شعر سن کر بہت خوش ہوئے اور اس طرح انٹرویو میں میرے لیے جو ایک مشکل مرحلہ آگیا تھا وہ بخیر و خوبی گزر گیا۔ اصل میں مجھے عاقل ہونے کا ہرگز کوئی دعویٰ نہیں یہ لفظ تو بطور تخلص میرے نانا مرحوم جناب فدا کا عطیہ ہے اور اس کا پس منظر بھی غالباً" یہ ہے کہ میں چار یا پانچ سال کا تھا کہ ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال کے انتقال کے بعد دہلی میں میرے بڑے بھائی قابل صاحب نے ایک کل ہند یادگار طرحی مشاعرہ منعقد کرایا جس کی کئی نشستیں ہوئیں جن میں سے ایک نشست کی صدارت جناب فدا مرحوم نے بھی کی یہ مشاعرہ آل انڈیا ریڈیو سے نشر بھی ہوا۔ اور اس میں اس وقت کے برصغیر کے تقریباً" تمام ہی ممتاز شعرا نے حصہ لیا۔ مصرعہ طرح علامہ اقبال مرحوم کا ایک مصرعہ تھا۔

"چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری"

اس موقع پر مجھے فدا صاحب نے میری کسی درسی کتاب کے ایک سبق کو منظوم کر کے مجھے دے دیا جسے میں نے یاد کر لیا اور اس مشاعرہ میں پڑھ دیا اور یہیں سے میرے نام منصور عالم میں عاقل کا اضافہ ہو گیا۔ خوب شاباش ملی اور بچپن کا یہ مجلسی تجربہ مستقبل کی ادبی زندگی کی بنیاد بن گیا۔

بہاولپور کے حوالے سے ایک بات کا ذکر بہت ضروری ہے کہ اس دور میں

مجھے نوجوانوں کی ایک تنظیم نیشنل یوتھ کونسل کے صدر کی حیثیت سے اس علاقے میں سماجی خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔ جس میں میرا ہاتھ بٹانے کے لئے مجھے تعلیم یافتہ ذہین مخلص اور خدمت ملی کے جذبہ سے سرشار نوجوانوں کی ایک ٹیم کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ نیشنل یوتھ کونسل کو انتظامیہ بالخصوص جناب ہاشم رضا جناب مسرت حسین زبیری اور جناب شفیع الرحمن کا جو اس وقت بہاولپور کے ڈپٹی کمشنر تھے اور اب ☆ سپریم کورٹ میں جج کے اعلی منصب پر فائز ہیں مربیانہ تعاون بھی ملتا رہا اور مقامی پریس کے علاوہ قومی اخبارت میں بھی ایک عرصے تک اس جماعت کی سرگرمیوں کے چرچے رہے اس کے دیگر اراکین میں جناب سلیم قریشی جنرل سیکرٹری کے عہدے پر فائز رہے ان سے برسوں بعد لندن میں ۱۹۷۷ء میں ملاقات ہوئی میں انہیں کا مہمان رہا اور یہ دیکھ کر بیحد خوشی ہوئی کہ لنکنز ان میں ان کا چیمبر ہے اور بیرسٹر کی حیثیت سے وہ وہاں کامیاب پریکٹس کر رہے ہیں اور انہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ ان کے کیریئر کی تعمیر و تشکیل میں نیشنل یوتھ کونسل نے اہم کردار ادا کیا ہے ☆ اصل میں نیشنل یوتھ کونسل کی زبردست کارکردگی کا اعتراف بہاولپور کی حالیہ تاریخ لکھنے والے ہر مورخ اور تبصرہ نگار نے کیا ہے جو میرے لئے بھی اعزاز کا باعث ہے۔

اردو اکیڈیمی

ایک اور اہم واقعہ بہاولپور میں ۱۹۵۸ء میں اردو اکیڈمی کا قیام ہے جس کا

☆ جناب شفیع الرحمن ۱۹۹۴ء کے اوائل میں سپریم کورٹ سے ریٹائر ہوگئے

☆ اس کے بعد مجھے جب بھی لندن جانے کا اتفاق ہوا میں سلیم قریشی صاحب ہی کے پاس ٹھہرا پرانی یادیں ہمیشہ موضوع گفتگو رہیں وہاں بھی دیکھا کہ انکا حلقہ تعارف بہت وسیع ہے۔ انہوں نے ہر بار میری آمد کے موقع پر ادبی تقریبات کا اہتمام کیا جن میں اور بہت سے اہل قلم سے تعارف ہوا ان حضرات میں جناب اکبر حیدر آبادی جن کا قیام اکسفورڈ میں ہے بہت خوبصورت غزل کہتے ہیں اور انگلینڈ میں مقیم غزل کہنے والوں میں بہت نمایاں ہیں - منصور عاقل

سہرا جناب مسرت حسین زبیری کے سر ہے جو اس وقت وہاں کمشنر تھے میں اگرچہ بہاولپور سے جا چکا تھا اور اس وقت ایمرسن کالج ملتان میں لیکچرر تھا لیکن زبیری صاحب نے اردو اکیڈمی کے تاسیسی اجلاس میں مجھے ملتان سے مدعو کیا اور اس ذیلی مجلس میں نامزد فرمایا جس نے اکیڈمی کا آئین مرتب کیا۔ اکیڈمی کے زیر اہتمام اب تک علمی و ادبی اور تحقیقی نوعیت کا خاصا کام ہو چکا ہے اور یہ ادارہ بہاولپور کے اہل قلم کے تعاون سے اپنے وجود کی شادابی کو برقرار رکھے ہوئے ہے حال ہی میں میرے بعض مطبوعہ ادبی مضامین کو جو میں نے اکثر بہاولپور ہی کے دوران قیام تحریر کیے تھے اردو اکیڈمی نے "حرف بہ حرف" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اکیڈمی سے میرے ذاتی تعلق کی نسبت سے میرے لئے یہ ایک اعزاز ہے۔

۱۹۵۶ء کے بعد سے بہاولپور سے میری قربت بتدریج دوری میں تبدیل ہوتی گئی انہیں دنوں مجھے کینساس یونیورسٹی (امریکہ) میں پولٹیکل سائنس میں ایک فیلو شپ کی پیشکش ملی لیکن اس پیشکش سے میں ذاتی وجوہ کی بناء پر استفادہ نہ کر سکا تاہم مجھے بہاولپور پھر بھی چھوڑنا پڑا اور بحیثیت لیکچرر میرا پہلا تقرر گورنمنٹ کالج میانوالی میں ہوا۔ میانوالی کا تصور میرے لیے بھیانک تھا مگر والدہ مرحومہ نے حوصلہ بندھایا اور میں وہاں چلا گیا دوسرے جناب مسرت حسن زبیری نے جو بہاولپور میں کمشنر تھے مجھے ایک نہایت قیمتی نصیحت سے نوازا اور کہا کہ سرکاری ملازمت میں اپنے ہی شہر میں تقرر کی خواہش کبھی نہ کرنی چاہیے کیونکہ اپنے عزیزوں دوستوں اور جاننے والوں میں رہ کر اپنے فرائض منصبی کی کماحقہ ادائیگی بہت مشکل ہو جاتی ہے اس وقت تو زبیری صاحب کی یہ بات میں نے احتراماً" قبول کر لی اور بہاولپور ایس۔ ای کالج میں ان کی ذاتی سفارش پر تقرر کی پیشکش سے بادل ناخواستہ استفادہ نہ کیا لیکن ان کی نصیحت کی قدر و قیمت مجھ پر اس وقت واضح ہوئی جب ۱۹۶۶ء میں راولپنڈی سے میرا تبادلہ بحیثیت اسسٹنٹ ڈائریکٹر انفارمیشن بہاولپور ہوا اور اپنی تعیناتی کی مختصر مدت میں مجھے اپنے بعض صحافی دوستوں کی خوشنودی پر اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کو ترجیح دینے کے تکلیف دہ تجربہ سے دو چار ہونا پڑا۔
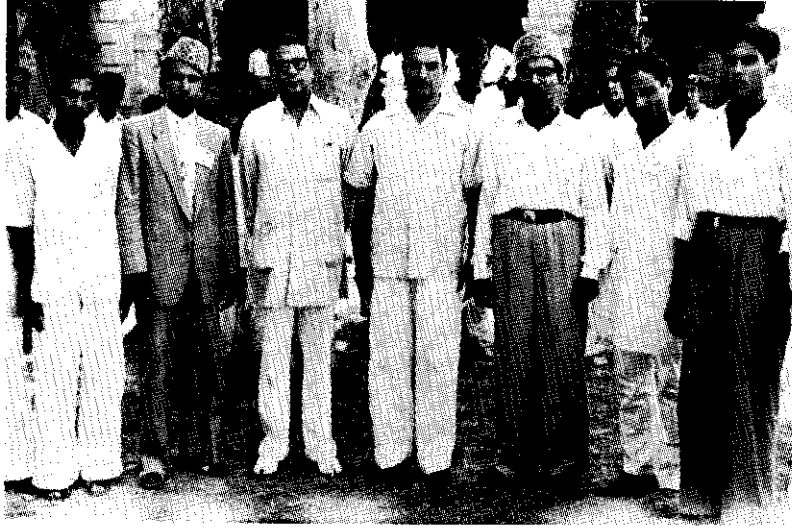
نیشنل یوتھ کونسل کے صدر کی حیثیت سے کمشنر بہاولپور جناب مسرت حسین زبیری
اور دیگر اراکین و عہدہ داران کے ساتھ گروپ فوٹو۔ (۱۹۵۷)

گورنمنٹ کالج میانوالی

دلچسپ بات یہ ہے کہ میانوالی جس کے بارے میں میں نے سنا تھا کہ وہاں
دن دھاڑے قتل بھی ہو جاتے ہیں میرے لئے ہرگز "بھیانک" ثابت نہ ہوا بلکہ وہاں
کا قیام میرے خوشگوار ترین تجربات میں سے ایک ہے۔ اولاً تو وہاں پہنچتے ہی میرے
"قیام و طعام" کا مسئلہ اس طرح حل ہوگیا کہ مجھے کالج ہاسٹل کے سپرنٹنڈنٹ کا چارج
بھی دے دیا گیا دوسرے مطالعہ کے لئے ماحول بھی نہایت سازگار ملا کیونکہ میانوالی
جیسے چھوٹے شہر میں مصروفیات ہی کیا ہو سکتی تھیں چنانچہ بیشتر وقت لکھنے پڑھنے میں
گزرا بلکہ یہ میانوالی ہی کا فیضان تھا کہ میں نے تاریخ میں ایک اور ایم اے کیا۔
میری تمام تر سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا مرکز کالج اور اس سے ملحقہ ماحول ہی رہا۔ شام
کے سائے گہرے ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سناٹا سا چھا جاتا تھا سو اس سناٹے کو
توڑنے کے لئے بھی میرے ایک رفیق کار پروفیسر ظہوالحسن ارزش جو فارسی کے استاد
تھے میرے پاس ہاسٹل آجاتے اور تقریباً ہر روز ہی ان کے ساتھ طویل نشست ہوتی
ارزش صاحب ایک اچھے شاعر تو تھے ہی' نہایت خوش گلو بھی تھے چنانچہ ہر روزان کی
شاعری اور خوش گلوئی سے محظوظ ہونے کے علاوہ ان شام کے سناٹوں میں میرے پاس
اور چارہ کار تھا بھی کیا۔ ایک روز ارزش صاحب نہیں آئے مجھے بڑی تشویش رہی
چنانچہ اگلے روز صبح میں نے ان سے کالج میں ان کے نہ آنے کا سبب دریافت کیا تو
کہنے لگے کہ کل جب میں آپ کی طرف آ رہا تھا تو میانوالی ریلوے سٹیشن کے باہر
میرے ایک پرانے دوست مجھے اچانک نظر پڑ گئے میں انہیں ایک قریبی ریستوران میں
لے گیا انہوں نے وہاں بیٹھتے ہی اپنا کلام سنانا شروع کر دیا اور تقریباً ایک گھنٹے کی
نشست کے بعد "میرا کلام سنے بغیر" یہ کہہ کر اجازت چاہی کہ ٹرین کا وقت ہوگیا ہے
اجازت دیجئے اور ہاں جب ملتان آئیں تو ملنا نہ بھولیے گا"

میں یہ واقعہ سنکر جو بھرپور لطیفہ بھی تھا خوب ہنسا اور ارزش صاحب سے
کہا کہ دیکھئے قدرت نے آپ سے میرا انتقام کس طرح لیا ہے ارزش صاحب نہایت
پرخلوص اور سادہ طبیعت انسان تھے اور دوستوں کے مذاق کا کبھی برا بھی نہ مانتے۔ وہ

فارسی اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور ان زبانوں میں بڑی روانی سے گفتگو کرتے تھے بلکہ ان کے فارسی بولنے کا انداز تو بالکل ایرانیوں جیسا تھا۔ میں راولپنڈی میں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۳ء تک اسسٹنٹ ڈائریکٹر انفارمیشن رہا۔ اس دوران پاکستان میں سرکاری طور پر "جشن شہنشاہیت ایران" بھی منایا گیا ارزش صاحب گورنمنٹ کالج کہوٹہ میں پرنسپل تھے مجھے جشن شہنشاہیت سے تو کوئی ذاتی دلچسپی نہ تھی البتہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ارزش صاحب کے تعاون اور ہم قلمی میں راولپنڈی ڈویژن کے شعرا کا فارسی کلام منتخب و مدون کرکے "مبارک نامہ" کے نام سے کتابی صورت میں سرکاری طور پر شائع کر دیا۔

میانوالی میں اگرچہ میرا قیام مختصر رہا لیکن وہاں ایسی گونان گوں شخصیتوں کی رفاقت میسر آئی جنہیں بھولنا میرے بس کی بات نہیں۔ کالج کے رفقائے کار میں عالم صاحب مرحوم (انگریزی) شریف صاحب مرحوم (جغرافیہ) ارزش صاحب مرحوم (فارسی) حسن طاہر صاحب (انگریزی) جعفر عباس زیدی صاحب (اردو) اور عمر فیضی صاحب جو اس وقت وہاں لائبریرین تھے نہایت اعلیٰ علمی و ادبی ذوق کے مالک تھے ان حضرات کے دم قدم سے کالج کا ماحول نہایت پرکشش اور پروقار ہو گیا تھا۔ کالج کے پرنسپل قاضی عبدالرشید صاحب مرحوم بہت دلچسپ شخصیت کے مالک تھے اور وائس پرنسپل عبدالقدیر علوی صاحب ان سے بھی کہیں زیادہ دلچسپ۔ علوی صاحب کا عالم یہ تھا کہ پرنسپل اگر چند لمحوں کے لئے بھی اپنے دفتر سے اٹھ کر کہیں جاتے تو وہ فوراً ان کی کرسی پر جا براجمان ہوتے اور پرنسپل کی واپسی تک دو ایک آفس آرڈر ضرور نکال دیتے بلکہ چپڑاسی کو ساتھ لے کر اپنے سامنے کالج کے نوٹس بورڈ پر چسپاں بھی کروا دیتے۔ میں پہلے دن جب اپنا تقررنامہ لیکر کالج میں حاضر ہوا تو اس دن علوی صاحب ہی "پرنسپل" تھے کیونکہ قاضی عبدالرشید صاحب مغربی پاکستان کا ایک ثقافتی وفد لے کر جس میں شوکت تھانوی مرحوم بھی شریک تھے مشرقی پاکستان گئے تھے علوی صاحب سے میری ملاقات چند لمحوں کے لئے ذہنی کوفت اور پریشانی کا باعث ہوئی لیکن جلد ہی میں علوی صاحب کو سمجھنے میں کامیاب ہو گیا بلکہ میری کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ علوی صاحب نے پہلے دن ہی مجھے ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ

مقرر کر دیا اور اس طرح میری رہائش کا مسئلہ خود بخود حل ہو گیا۔ علوی صاحب کے لطیفے یوں تو کالج میں ہر روز ہی ہوتے رہتے تھے لیکن ان کا ایک لطیفہ شاہکار ہے۔ ہوا یوں کہ کالج میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت ڈپٹی کمشنر میانوالی کو کرنا تھی اور وہ اس لئے کہ ہمارے ملک میں کوئی قومی اجتماع ہو یا ادبی' صدارت بہرحال کمشنر یا ڈپٹی کمشنر یا کسی ایسے حاکم وقت کے حصے میں آنے کی روایت رہی ہے جو "سزا و جزا" دونوں پر قادر ہو بہرحال جلسہ تو ترتیب پا گیا مگر ڈپٹی کمشنر صاحب نہیں پہنچے۔ پرنسپل قاضی عبدالرشید صاحب نے کافی وقت گذرنے کے بعد کرسی صدارت کو خالی رکھتے ہوئے ہی جلسہ کی کارروائی شروع کرا دی۔ علوی صاحب اگلی ہی صف میں بیٹھے تھے اور اس صورت حاصل پر سخت پیچ و تاب کھا رہے تھے چنانچہ جلسہ کی کارروائی کے دوران ہی ایک نعرہ مستانہ بلند کیا اور چھلانگ لگا کر صدر کی کرسی پر جا بیٹھے اور ایسے بیٹھے جیسے وہاں صدیوں سے بیٹھے ہوں۔ علوی صاحب کو کرسی صدارت سے اٹھانا قاضی صاحب کے بس کی بات نہ تھی چنانچہ اسلامیات کے استاد رانا بہاء الحق کی خدمات حاصل کی گئیں جو علوی صاحب کو جسمانی طور پر اٹھا لے جانے کی "صلاحیت" رکھتے تھے۔

پرنسپل قاضی عبدالرشید صاحب فزکس کے آدمی تھے اور ذہنی اعتبار سے ان میں اور علوی صاحب میں انیس بیس ہی کا فرق ہو گا دن رات ایٹم پر اپنی ریسرچ کے قصے سنا سنا کر لوگوں کو نڈھال کر دیتے بات کرتے تو برابر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں ملتے رہتے ان کی اس حرکت کو لوگ تو کف افسوس ملنے سے تعبیر کرتے (کیونکہ ایٹم پر ان کی ریسرچ اب تک بے نتیجہ ہی رہی تھی) لیکن میں ان کی اس حرکت کو "کف مسرت" کہتا قاضی صاحب نے یہ بات سنی تو بہت خوش ہوئے لیکن انہوں نے سب سے زیادہ میرے ہی صبر کا امتحان لیا کالج ہاسٹل کے سامنے ان کا بنگلہ تھا باہر بیٹھتے تو مجھے بلا لیتے اور گھنٹوں سلسلہ تقریر ختم کرنے کا نام نہ لیتے بلکہ دوران گفتگو ایسی دور کی کوڑی لاتے کہ سننے والا حیران رہ جاتا فرمانے لگے کہ میں اپنے حالیہ دورہ مشرقی پاکستان کے دوران ایک روز ڈھاکہ کے بازار سے گزر رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی قاضی صاحب۔ قاضی صاحب۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو نورالامین میرے پیچھے بھاگے چلے

آ رہے تھے ایک اور سلسلہ گفتگو کے دوران ارشاد فرمایا کہ میں لائلپور گورنمنٹ کالج میں تھا ایک روز رات کو بارہ بجے میرے دروازے پر زور زور سے دستک کی آواز سنائی دی میں نے بالکنی سے دیکھا تو نیچے حسین شہید سہروردی کھڑے تھے انہوں نے مجھے وزارت تعلیم کی پیشکش کی اور میں نے بالکنی ہی سے معذرت کرلی غرض جو بھی سامع ان کے ہاتھ آ جاتا تھا قاضی صاحب اس کا عرق نکال لیتے تھے میں حیران تھا کہ اول تو یہ حضرت ایک ثقافتی وفد کے سربراہ کیسے بن گئے دوسرے وفد کے اراکین میں شوکت تھانوی جیسے لوگوں کے ساتھ کس طرح گزارا ہوا ہو گا۔ مگر معلوم ہوا کہ قاضی صاحب تو شوکت صاحب کی پسندیدہ شخصیت تھے انہیں دنوں شوکت صاحب مرحوم بھی میانوالی آئے اور ایسا لگا جیسے وہ قاضی صاحب کی صورت میں اپنے افسانوں کے لئے ایک نیا اور جیتا جاگتا کردار مل جانے پر بہت مسرور ہوں۔ کالج میں ایک نشست مشاعرہ بھی ترتیب دی گئی لیکن اس بار صدارت کے لئے ڈپٹی کمشنر کو منتخب نہیں کیا گیا بلکہ ان دنوں میانوالی میں قمر رضا ایس۔ پی تھے اور جناب کاظم رضا صاحب ان کے پاس کراچی سے آئے ہوئے تھے چنانچہ صدارت کاظم رضا صاحب نے کی۔ شوکت تھانوی مرحوم کی غزل کا یہ مطلع مجھے آج تک یاد ہے۔

جان دیگر بھی قلق باقی ہے
اے محبت ترا حق باقی ہے

ایمرسن کالج ملتان

۱۹۵۸ء کے آغاز میں میرا تقرر گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان میں ہو گیا مگر اس وقت تک میں نے صرف "گرد و گرما گدا و گورستان" کے حوالے ہی سے ملتان کا ذکر سنا تھا۔ ایک آدھ دفعہ سے زیادہ دیکھا بھی نہیں تھا صابر دہلوی مرحوم سے وہیں ملاقات ہوئی اور مجھے ذوق کا یہ شعریاد آگیا۔

دلی میں اب کہاں وہ رہی آب و تاب حسن
اے ذوق پانی اب تو وہ ملتان بہہ گیا

صابر صاحب کے پوتے انوار انجم کالج میں میرے طالبعلم تھے بڑے ہونہار اور شعر کہنے کی خدا داد صلاحیت رکھتے تھے افسوس اس نوجوان کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ مجھے یقین تھا کہ وہ بحیثیت شاعر ایک بلند مقام تک پہنچتا۔ ملتان میں ایک اور بزرگ شاعر جناب منظور الحسن ضیاء حسین آگاہی میں رہتے تھے محکمہ نہر کی ملازمت سے ایک عرصہ پہلے بحیثیت ڈپٹی کلکٹر ریٹائر ہوچکے تھے اور فالج کے باعث گھر سے باہر آنے جانے سے معذور تھے مجھ سے اس لئے خصوصی شفقت فرماتے کہ میرے بڑے بھائی علامہ سید قابل کے احباب خاص میں سے تھے بزم ضیائے ادب کے نام سے ایک ادبی انجمن ان کے نام سے منسوب تھی جس کے ماہانہ مشاعرے بڑی باقاعدگی سے انہیں کے دولت کدہ پر منعقد ہوتے جن میں ملتان کے تقریباً" سب ہی قابل ذکر شعراء شریک ہوتے کیونکہ ضیاء صاحب مرحوم کا سب بیحد احترام کرتے تھے میں اک روز بہاولپور سے تعطیلات کے بعد آیا اور شام کے وقت ضیاء صاحب سے ملنے گیا تو انہوں نے بتایا کہ بعد مغرب مشاعرہ کی نشست ہے اور مجھے روک لیا مصرعہ طرح بتایا اور کہا کہ مشاعرہ میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہے غزل کہہ لیجئے میں اس امتحان کے لئے تیار تو نہ تھا لیکن وہ عمر ایسی تھی کہ میں ہی نہیں بلکہ ہر نوجوان خود کو منوانے کا خواہشمند ہوتا ہے چنانچہ غزل کہی جو مشاعرہ میں پسند کی گئی بلکہ ضیاء صاحب نے میری غزل کے اس مطلع کو بیحد پسند فرمایا۔

منزل اگر نہیں ہے نہ ہو جستجو تو ہے
ان سے خیال ہی میں سہی گفتگو تو ہے

اس کے بعد ضیاء صاحب نے میری مزید حوصلہ افزائی بلکہ عزت افزائی اس

طرح فرمائی کہ آئندہ مشاعرہ کی صدارت پر مجھے حکماً مجبور کیا جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں شعر و ادب سے میری وابستگی ہمیشہ طالب علمانہ بلکہ والہانہ رہی البتہ اس وابستگی میں ماحول کی اثر پذیری کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے چنانچہ جب شعر کہے تو مسلسل کہے اور جب ذہن و وجدان کو ترغیب دینے والا ماحول میسر نہ آیا۔ تو کئی کئی سال بیگانہ وار گزر گئے یہی وجہ ہے کہ میں نے خود کو کبھی باضابطہ شاعر نہیں گردانا۔ ملتان کے دوران قیام ادبی گہما گہمی خاصی رہی اور طبیعت ہمیشہ موزوں رہی چنانچہ ضیاء صاحب والے مشاعرہ میں صدارت آئندہ کے لئے بھی میرے گلے کا ہار اس لئے ہو گئی کہ میں نے شعراء کے کلام پر جو برجستہ منظوم تبصرے کیے ان پر جناب ضیاء نے بیحد اظہار پسندیدگی فرمایا اور جب تک میں ملتان میں رہا مجبور کر کے اپنے اکثر مشاعروں کی صدارت کا اعزاز مجھے بخشا۔

محفل یاراں

ملتان میں مجھے صرف ایک ہی تکلیف رہی کہ نہ رہائش کا کوئی معقول انتظام تھا اور نہ کھانے کا۔ لہٰذا نصف دن کی چھٹی میں بھی جی چاہتا تھا کہ بہاولپور چلا جاؤں تاہم شہر کا علمی و ادبی ماحول بڑا پرکشش تھا میں شام کا کھانا اکثر رائل ہوٹل میں کھاتا تھا جو بوہڑ دروازہ کے باہر واقع تھا ہوٹل میں جاتے مجھے دو ایک دن ہی گزرے تھے کہ میں نے دیکھا بعض حضرات ہر روز ہی محفل جمائے رہتے ہیں یہ لوگ مجھے بڑے بے تکلف لیکن شائستہ لگے کیونکہ ان کی گفتگو جو میں دور ہی سے سنتا تھا بڑی ادیبانہ اور شاعرانہ ہوتی۔ ایک روز اچانک میں نے دیکھا کہ اس "محفل یاراں" میں میرے ایک عزیز جناب سید احمد بھی شریک ہیں میں ان سے فوراً ملا اور ہم ایک دوسرے سے مل کر بیحد خوش ہوئے۔ سید صاحب محکمہ انکم ٹیکس میں ملازم تھے اور اس محفل یاراں کے اہم رکن۔ انہوں نے میرا تعارف موجود حضرات سے کرایا اور ابھی یہ تعارف ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ایک صاحب سیاہ چہرے پر سفید زلفیں لٹکائے ہاتھ میں ریکسین کا ایک تھیلا لئے اور جھومتے ہوئے وہاں پہنچے تو سید صاحب نے ان سے

بھی مجھے متعارف کرنا چاہا لیکن انھوں نے کہا کہ میں انہیں جانتا ہوں اور ثبوت کے طور پر اپنے تھیلے سے ایک فہرست نکالی جس میں میرا نام بھی شامل تھا یہ صورتحال دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ مجھے ملتان میں آئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے یہ صاحب طاہر کپور تھلوی تھے اور وہ فہرست جو انھوں نے اپنے تھیلے سے برآمد کی تھی شعراء کے ناموں پر مشتمل تھی جنہیں آئندہ چند روز میں ہونے والے مشاعرہ میں وہ مدعو کرنا چاہتے تھے۔ سید صاحب نے طاہر صاحب کی صفات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شاعر اس شہر میں آئے اور چوبیس گھنٹے کے اندر اندر طاہر صاحب کو اس کا علم نہ ہو جائے۔ طاہر صاحب ہر چند شاعر محض تھے مگر بڑے سادہ انسان اور محبت و خلوص کے پیکر جس روز وہ نہ آتے محفل سونی رہتی۔ کیونکہ وہ آتے تو اپنی تازہ غزل ترنم سے ضرور سناتے ایک روز ان کے ایک شعر نے تو مجھے آبدیدہ کر دیا۔ ۱۹۴۷ء کے تبادلہ آبادی کے نتیجہ میں رونما ہونے والے سانحات کی اس سے زیادہ دل دوز تفسیر اور کیا ہو سکتی تھی!

چشم گردوں بھی ترستی تھی کبھی جن کے لئے
اب وہ چہرے سر بازار نظر آتے ہیں

ان ارباب نشست میں جناب مقصود احمد قریشی بھی تھے جو سب سے زیادہ معمر لیکن انتہائی قہقہہ بار شخصیت ان کی شیشہ کی دوکان رائل ہوٹل کے سامنے ہی تھی۔ شعر کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے یعنی شعر سن کر داد اس طرح دیتے کہ شعر کے تمام معائب و محاسن نہایت خوبصورتی سے واضح کر دیتے ان کی بزلہ سنجی کے باعث کسی بھی محفل میں ان کی بزرگی پھیکا پن پیدا نہ ہونے دیتی۔ قریشی صاحب کے ایک بیٹے کالج میں میرے شاگرد بھی تھے چنانچہ رائل ہوٹل کی ہماری ان محفلوں کا ذکر ان صاحبزادے کے ذریعہ کالج تک پہنچا نتیجہ میں کالج میں شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے طالب علم اکثر میرے گرد رہنے لگے اک روز ایک طالب علم ملتان اکیڈیمی کا ایک دعوت نامہ میرے نام لے آئے جو اکیڈیمی کے مہتمم آغا شیر احمد خاموش کے

دستخطوں سے جاری ہوا تھا چنانچہ میں اس محفل میں حاضر ہوا جہاں موضوع سخن غالب کی فارسی شاعری تھا اور صدر محفل ڈپٹی کمشنر جناب مختار مسعود۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت کوفت ہوئی اور محسوس ہوا کہ علمی و ادبی محفلوں کی صدارتیں کسی بھی شہر میں ڈپٹی کمشنروں سے محفوظ نہیں لیکن چند ہی لمحوں بعد میری یہ کوفت انتہائی تعجب میں تبدیل ہو گئی جب میں نے دیکھا کہ محفل کا آغاز ہوتے ہی روایت کے بالکل برعکس صدر محفل کھڑے ہوئے اور موضوع پر اظہار خیال شروع کر دیا مختار مسعود صاحب سے میرا یہ پہلا مجلسی تعارف تھا وہ نہایت خوبصورت زبان اور لہجے میں غالب کی فارسی شاعری کا تجزیہ کر رہے تھے ان کی تقریر اس قدر برجستہ اور پرمغز تھی کہ میں انہیں محض ڈپٹی کمشنر سمجھ بیٹھنے پر دل ہی دل میں بہت نادم ہوا اور ان کی قابلیت ذہانت اور حافظہ کی خوبیوں کا جو تاثر مجھ پر قائم ہوا۔ وہ آج بھی اسی طرح تر و تازہ ہے مختار مسعود صاحب نے موضوع کے حوالے سے اپنی گفتگو میں اتنا کچھ مواد مہیا کر دیا تھا کہ بعد کے مقررین کے لئے مزید کچھ کہنا بذات خود ایک مسئلہ بن گیا تھا چنانچہ مجھے بھی جب اظہار خیال کی دعوت دی گئی تو سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا کہوں بہرحال موضوع سے قدرے انحراف برتتے ہوئے میں نے غالب کے فارسی اور اردو کلام میں فکری اور موضوعاتی متوازیت پر گفتگو کی اور غالب کے اس دعوے کے خلاف کہ

فارسی بیں تابہ بنی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

ریختہ میں بھی غالب کی استادی کو ثابت کیا مختار مسعود صاحب کو یہ انداز نظر بہت پسند آیا جس کا ذکر انہوں نے اپنے اختتامی کلمات میں بطور خاص کیا۔ نومبر ۱۹۵۸ء میں ملتان چھوڑنے سے پہلے ان سے چند ملاقاتیں اور بھی ہوئیں اور ہر بار میں نے ذہنی جلا محسوس کی دسمبر ۱۹۵۸ء یا جون ۱۹۵۹ء میں انہوں نے ملتان میں ایک کل پاکستان مشاعرہ کا اہتمام کیا جس میں از رہ قدر افزائی مجھے خود خط لکھ کر مدعو کیا میں اس وقت ایمرسن کالج ملتان سے استعفیٰ دے کر خیرپور میرس جا چکا تھا جہاں پبلک سروس کمیشن

گورنمنٹ کالج لائلپور میں منعقدہ ایک محفل میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدیر عوام خلیق قریشی (مرحوم) تقریر کررہے ہیں- برابر میں پرنسپل کرامت حسین جعفری بیٹھے ہیں- (۱۹۶۳)

کے مقابلہ کے امتحان میں کامیابی کے بعد بحیثیت ڈویژنل انفارمیشن آفیسر میرا تقرر ہوا تھا۔ ملتان کا یہ مشاعرہ حقیقت میں "عظیم الشان" تھا اور جناب مختار مسعود کے حسن انتظام کا شاہکار۔

ملک میں نیا نیا مارشل لاء لگا تھا چنانچہ اس ضمن میں ایک لطیفہ یہ بھی ہوا کہ ملتان میں بوہڑ دروازہ کے باہر جس بالا خانے پر مذاق العیشی صاحب نے اپنے استاد جناب عیش فیروز پوری سے منسوب "بزم عیش" کا ایک بورڈ آویزاں کیا ہوا تھا وہاں چھاپہ پڑ گیا اور انہیں گواہیاں دے کر اور یہ کہہ کر اپنی جان چھڑانا پڑی کہ یہاں عیش و عشرت کا کوئی کاروبار نہیں ہوتا بلکہ یہ شعراء کی ایک انجمن کا دفتر ہے جہاں صرف مشاعرے ہوتے ہیں۔

کالج کی ملازمت سے استعفیٰ دینا مجھے بہت شاق گزرا اور حقیقت یہ ہے کہ میں آج تک یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرا اصل فیلڈ ہی شعبہ تعلیم تھا مجھے اس بات کی تو ہرگز پروا نہ تھی کہ معاشرہ میں ایک معلم کا مقام و مرتبہ وہ نہیں جو ہونا چاہیے لیکن ایک سے دوسرے کالج میں تبادلے کے بعد جب چھ چھ ماہ تنخواہ بند رہتی تو میں سخت پریشان ہو جاتا ملتان میں کم و بیش آٹھ ماہ تک مجھے ٹیوشنیں کر کے گزارا کرنا پڑا مجھ جیسے انسان کے لئے یہ صورت حال بڑی ہی جاں گسل تھی جس کے ذہن میں "علم فروشی" کا تصور ہی گناہ آلود ہو چار و ناچار استعفیٰ دینا پڑا۔ تاہم انفارمیشن کی ملازمت میں آنے کے بعد اہل قلم سے رابطہ باقی رہنا میرے لئے باعث طمانیت تھا۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۴ء کے وسط تک میں لائلپور (حال فیصل آباد) میں انفارمیشن آفیسر رہا وہاں بھی مقامی کالجوں ہی میں میرا ربط ضبط زیادہ رہا پروفیسر کرامت حسین جعفری مرحوم گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے اور مجلس اقبال لائلپور کے صدر بھی مجلس اقبال کی تقریبات میں میری سرگرمی سے شرکت میرے اور ان کے مابین قریبی اور پر خلوص مراسم کا وسیلہ بن گئی تھی چنانچہ گورنمنٹ کالج میں جب ایم اے اردو کی کلاسیں شروع کی گئیں تو جعفری صاحب مرحوم نے ان کلاسوں کا آغاز مہمان لیکچرر کی حیثیت سے میرے ہی لیکچر سے کرایا اور اپنی تقریر میں محکمہ تعلیم سے میرا تعلق ٹوٹ جانے پر افسوس کا اظہار کیا۔

خیرپور میں قیام

خیرپور کے دوران قیام (۵۹-۱۹۵۸ء) بھی میری علمی دلچسپیوں کا مرکز مقامی گورنمنٹ ممتاز کالج ہی رہا پروفیسر کرار حسین خیرپور میں میری تقرری سے کچھ عرصہ پہلے ہی وہاں سے تبدیل ہو گئے تھے لیکن ان کی علمی صحبتوں کی یادیں اھل خیرپور کے لئے سدا بہار تھیں ویسے بھی میں نے خیرپور کی فضا میں ایک دلپذیر سکون اور ٹھہراؤ سا محسوس کیا خیرپور کا وہ مقام تو ختم ہو چکا تھا جو اسے ریاست کی حیثیت سے حاصل تھا لیکن ریاستی دور میں مرزا ممتاز حسن قزلباش کی وزارت عظمی کے دوران یہ خطہ مہاجر اھل تشیع کے لئے خاص طور پر باعث کشش ثابت ہوا۔ جس کے نتیجہ میں بدایوں۔ امروہہ۔ ملیح آباد۔ لکھنؤ اور یو پی کے دوسرے علاقوں سے آئے ہوئے بیشمار خاندان یہاں آباد ہو گئے۔ یہی نہیں بلکہ ان حضرات نے اودھ جیسی تہذیب و معاشرت کا وہی نقشہ یہاں جما دیا جس کا ایک دھندلا سا خاکہ میرے ذہن میں تھا اور جسے افسانہ و شعر کے تاریخی مطالعہ سے کبھی کبھی جلا ملتی رہتی تھی مجھے خود لکھنؤ جانے کا تو موقع کبھی نہیں ملا البتہ اس کی روایتی تہذیب کا ھوبہو نقشہ خیرپور میں دیکھ کر مجھے یقین نہ آتا تھا کہ یہ جگہ صوبہ سندھ کا حصہ بھی ہو سکتی ہے۔ مقامی تہذیب و معاشرت کا رنگ بڑی حد تک دب کر رہ گیا تھا۔ شیروانیاں یا انگرکھے زیب تن کیے لوگ جابجا نظر آتے ٹوپیوں میں بھی دوپلو یا رامپوری اور پان کھانے کا وہی مخصوص انداز یہی نہیں بلکہ السلام علیکم کہنے کا رواج کم اور آداب یا تسلیمات کی روایت زیادہ اور وہ بھی فرشی انداز میں۔

اس سلسلہ میں مجھے خیرپور میں دوسری بار اپنی تقرری کے دوران (۶۹-۱۹۶۸ء) ایک واقعہ یاد آگیا۔ شام کو اکثر میرا اٹھنا بیٹھنا اپنے ایک دوست سید تعظیم حسین نقوی کے یہاں ہوتا تھا وہیں اکثر شعر و ادب کی بے تکلفانہ محفلیں جمتیں۔ سردیوں میں خاص طور پر خوش گپیوں کا یہ سلسلہ راتوں کو دیر تک جاری رہتا اور تعظیم صاحب جی کھول کر مہمانوں کی تواضع کرتے ان کا مکان شہر کے ایک گنجان

کوچے میں واقع تھا یہ نشست ان کے مکان کے بیرونی کمرے میں رہتی جہاں سے گذر کر بعض اوقات ان کے بچے مکان کے اندر بھی جاتے۔ ایک روز غالباً" ان کا بڑا بیٹا محمود وہاں سے گزرا۔ میں تعظیم صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ محمود نے مجھے السلام علیکم کہا اور اندر چلا گیا میں نے دیکھا کہ تعظیم صاحب یکدم خاموش ہو گئے اور چند ہی لمحوں میں ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ اٹھ کر اندر چلے گئے اور فوراً ہی میں نے سنا کہ وہ محمود پر برس رہے ہیں باہر آئے تو میں نے پوچھا کہ بھئی کیا ماجرا ہے وہ غصے سے بے حال ہو رہے تھے پھولی ہوئی سانس کے عالم میں بمشکل مجھے بتایا کہ اس دور نے بچوں کو بد تہذیب بنا دیا ہے چھوٹے بڑے کی تمیز اٹھ گئی ہے وہ اس گستاخی کو برداشت کر سکتے ہیں نہ معاف میں نے پوچھا آخر ایسی بھی کیا بات ہو گئی کہنے لگے کہ محمود نے آپ کو بجائے آداب یا تسلیمات کے السلام علیکم کہا گویا آپ اس کے ہم عمر ہیں دوست ہیں اسے یہ احساس ہی نہیں کہ آپ اس کے باپ کے دوست ہیں بزرگ ہیں اور باپ کی جگہ ہیں مجھے یہ سن کر ہنسی آگئی اور میں نے انہیں نئے وقت اور ماحول کے ساتھ سازگاری کا لاکھ مشورہ دیا لیکن میری بات ان کی سمجھ میں نہ آئی۔

یہ تو تھی ۱۹۶۸ء کے خیرپور کی ایک جھلک حالانکہ اس وقت تک حالات بہت بدل چکے تھے ماحول کو سیاست نے ازحد پراگندہ کر دیا تھا ریاستی سرپرستی کو ختم ہوئے بھی ایک مدت بیت چکی تھی جس کے نتیجہ میں بہت سے خانداں ترک سکونت کر کے کراچی جا چکے تھے جو باقی تھے ان کی بگڑتی ہوئی معاشی حالت ان کی وضع داری اور روایت پرستی میں سد راہ بن گئی تھی لیکن ۱۹۵۸ء کے خیرپور میں اودھ رنگ تہذیب کی کارفرمائی زیادہ نمایاں تھی مجھے خیرپور کے گلی کوچوں میں تہذیب رفتہ کی پرچھائیاں دیکھ دیکھ کر عجیب سا احساس ہوتا شام ہوتی تو بعض لوگ اپنے گھروں کے بیرونی احاطوں میں بیٹھتے چھڑکاؤ سے گرمیوں میں زمین کو تازہ کیا جاتا۔ موڑھے اور کچھ آرام کرسیاں سجا دی جاتیں درمیان میں اکثر لمبی نے والا حقہ ہوتا نشست کے دوران پان آتے تو خاص دان میں اور گلوریوں کی شکل میں۔

مشاعرے

میرے دفتر کے سٹاف میں ایک صاحب تھے ابوالحسنین ناطق بدایونی جو ۱۹۶۸-۶۹ء میں دوسری بار بھی میرے تقرر کے دوران وہیں تھے بڑے ثقہ بزرگ تھے۔ طور طریق۔ گفتگو لباس غرض کسی عنوان بھی وہ دفتری اہلکار معلوم نہیں ہوتے تھے اور بعد میں اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر ہو جانے کے باوجود بھی وہ کسی ڈھب سے بھی افسر نظر نہ آتے البتہ ہر دیکھنے والا محض ایک ہی نظر میں ان کے شاعر ہونے پر ایمان لے آتا تھا چنانچہ اولا" مجھے ناطق صاحب ہی خیرپور کے مشاعروں میں کھینچ لے گئے یہاں کچھ عجیب ہی نقشہ دیکھا ابھی شاعر بمشکل ایک مصرعہ ہی پڑھ پاتا تھا کہ ایک غدر سا برپا ہو جاتا اور یہ غدر بڑھتے بڑھتے بلوے کے سی کیفیت اختیار کر لیتا بہرحال ان دنوں خیرپور کے مشاعروں میں داد دینے کا یہی انداز تھا۔ البتہ داد یا بیداد کے ان ہنگاموں میں کچھ ایسے محتاط لوگ بھی ہوتے جن کو دیکھ کر مجھے صائب کا یہ شعر بار بار یاد آیا۔

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را
تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

مشاعروں میں واہ واہ کے اس انداز نے بہت سوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا جس کے نتیجہ میں ان مشاعروں میں "استادوں" کی خاصی تعداد دیکھنے میں آتی بعض تو شاگردوں کی کھیپ بھی اپنے ساتھ لاتے۔ تاکہ حریف استاد کے مقابلے میں داد کے ڈونگرے برسانے کا پیشگی انتظام ان کی "شاعرانہ عظمت" کا لوہا منوا سکے ایسے استاد شاعر اکثر محلہ لقمان سے آتے۔ ابھی میں نے ایسے دوچار ہی مشاعروں میں بجبر شرکت کی تھی کہ مجھے اپنی ہمت جواب دیتی دکھائی دی۔ خدا کا شکر کر خیرپور ہی میں شعر و ادب کا ایک مختلف ماحول بھی موجود تھا اور یہی میری پناہ گاہ ثابت ہوا۔ بعض احباب کے گھروں پر جن مخصوص شعری نشستوں میں شرکت کی ان کا لطف آج بھی میری یادوں کا سرمایہ ہے بالخصوص شہر کے باذوق اور روشن خیال نوجوانوں کی ادبی انجمن

"ادبستان" کے اجلاس ریگزار خیرپور میں نخلستان سے کم نہ تھے۔

جمشید رضا الرحیم مرحوم کے بعد مفتون احمد جو خیرپور میں اسسٹنٹ کمشنر تھے ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر تعینات ہوئے ان سے اس حیثیت میں کہ وہ ایک اچھے افسانہ نگار بھی تھے "ادبستان" ہی میں تعارف ہوا۔

سچ یہ ہے کہ خیرپور میں میری پذیرائی بھی بہت ہوئی لوگ بڑی محبت سے پیش آتے۔ اور میں جس محفل میں بھی شریک ہوتا مجھے خصوصی توجہ سے نوازا جاتا خیرپور میں قیام مختصر ہونے کے باوجود مجھے لکھنے پڑھنے کا خاصا موقع ملا شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں وہاں تنہا رہتا تھا کیونکہ والدہ مرحومہ اور دیگر اہل خانہ بہاولپور ہی میں تھے ویسے بھی مشاعرے ہوتے تو اکثر طرحی اور مجھے چار و ناچار کچھ نہ کچھ کہنا پڑتا خیرپور کے شعر کہنے والوں میں دو واضح گروپ تھے ایک خالص قدامت پسند اور دوسرا ادب میں جدید قدروں کا علمبردار۔ دوسری وضع کے لوگ نسبتاً" کم تھے البتہ ادبستان کے زیر اثر قدیم و جدید کے امتزاج سے متاثر ایک تیسرا گروہ بتدریج ابھر رہا تھا اور میں ان تینوں رجحانات فکر کے مطالعہ و مشاہدہ کے ہر موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا۔ میں خیرپور سے چلا آیا تو بھی بعض حضرات نے مراسلت کے ذریعہ مجھے یاد رکھا بلکہ مجھے ایک بار بڑے عجیب و غریب انداز میں خیرپور جانے کا موقع ملا تو میں نے اسے غنیمت جان کر فوراً رخت سفر باندھ لیا ہوا یوں کہ ۱۹۵۹ء کے اوائل میں جب میں وہاں تعینات تھا تو ایک روز میں نے چپڑاسی کو گھر کی چابیاں دے کر بھیجا اور اپنے بعض کاغذات منگوائے واپسی پر دیکھا تو وہ اپنے ساتھ ایک شخص کو پکڑے لا رہا ہے کہنے لگا کہ یہ شخص مجھ سے پہلے ہی گھر کا تالا کھول رہا تھا چور ہے اسے پولیس کے حوالے کر دیجئے میں نے کہا کہ اس بیچارے کی حسرت تو دل کے دل ہی میں رہ گئی اور میرا بھرم بھی باقی رہ گیا اسے جانے ہی دو لیکن دفتر والے اسے خود ہی کوتوالی پہنچا آئے چنانچہ اس واقعہ کے تقریباً دو سال بعد مجھے لاہور میں خیرپور کی عدالت کی طرف سے ایک پروانہ طلبی (سمن) ملا۔ اول تو مجھے یاد ہی نہ آتا تھا کہ یہ پروانہ آخر کس سلسلہ میں موصول ہوا ہے بہر حال ذہن پر زور ڈالا تو یاد آگیا لیکن جب عدالت پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ بیچارہ جس کا نام غالباً" ہارون تھا چھ ماہ تک جیل میں اپنے عدالت میں پیش

ہونے کا انتظار کرتے کرتے ایک روز فرار ہو گیا اور اس بہانے مجھے خیر پور کے دوستوں سے ملاقات کا ایک موقع اور مل گیا لیکن اس روز کافی دیر تک میرا ذہن سخت بوجھل رہا اور میں نظام انصاف کی بوالعجبی کے ہاتھوں اس بیچارے چور کی ناکردہ گناہی کے باوجود بے حساب سزا یابی پر ملول رہا۔ غالب نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔۔۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

خیرپور کی تہذیب و ثقافت

دوسری بار (۶۹-۱۹۶۸ء) میں پورے دو سال خیرپور میں رہا اور اس بار ایک نیا لطف آیا ماحول خاصا بدل چکا تھا پھر بھی جس طرح نمک مقدار میں کم ہونے کے باوجود ذائقہ پیدا کر دیتا ہے بالکل اسی طرح خیرپور میں اگلے لوگوں میں سے بچے کچے لوگ ہی شہر کی تہذیب و ثقافت کی آبرو بنے ہوئے تھے۔ بعض تنگدستی کے باوجود جان پر کھیل کر وضع قائم رکھنے کی کوشش کر رہے تھے ایسے ہی ایک صاحب جو تخلص کے اعتبار سے امانت لکھنوی کے دور کے روایت پرست معلوم ہوتے لیکن فکر و فن کے اعتبار سے واقعی انقلابی تھے زخم بدایونی تھے جن سے خیرپور کا بچہ بچہ واقف تھا لیکن ان کا تخلص "زخم" ہونے نے تو ایک مرتبہ میرے گھر کے گھر کو پریشان کر دیا۔ وہ ۱۹۵۹ء میں ایک دفعہ بہاولپور آئے اور مجھ سے میرے گھر کا پتہ لیتے آئے گھر پہنچے دستک دی تو میری بھتیجی جو غالباً" چار یا پانچ سال کی تھی باہر آئی زخم صاحب نے کہا بیٹی اماں سے کہو کہ چچا جان کے پاس سے زخم آئے ہیں بچی کچھ اس طرح سمجھی کہ اس نے والدہ سے جا کر کہا کہ باہر ایک صاحب آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ چچا جان کے زخم آئے ہیں یہ سن کر والدہ زار و قطار رونے لگیں میرے بڑے بھائی منظور عادل گھر ہی میں تھے سخت حواس باختہ ہو کر باہر بھاگے۔ زخم صاحب سمجھ گئے اور فوراً انہیں اپنے تخلص کی ندرت سے آگاہ کیا بہر حال زخم صاحب جتنے مفلسی کے ہاتھوں بے حال

گورنمنٹ ممتاز کالج خیرپور میرس (سندھ) کے زیر اہتمام منعقدہ ایک ادبی مذاکرے
میں بحیثیت صدر (۱۹۶۸)

تھے اتنا ہی ان کی خود داری انہیں پاس وضع پر اکساتی ان کی باقی زندگی اسی کشمکش میں گزری میں دل ہی دل میں ان کی زبوں حالی پر بہت کڑھتا ایک مرتبہ میں نے ممتاز کالونی میں اپنے مکان پر ایک عشائیہ اور نشست مشاعرہ کا اہتمام کیا مشاہیر شہر، شعراء اور اعلی افسران جن میں کمشنر خیرپور بھی تھے شریک محفل تھے مشاعرہ کا آغاز ہوا چاہتا تھا اور حاضرین کمشنر خیرپور ڈویژن کے مسند صدارت پر رونق افروز ہونے کے منتظر تھے کہ میں نے صدارت کے لئے جناب زخم بدایونی سے درخواست کی ایک لمحہ کے لئے محفل پر سناٹا چھا گیا کیونکہ زخم صاحب میونسپل کمیٹی خیرپور میں "پیادے" کی حیثیت سے ملازم تھے اور یہ منصب چپڑاسی سے بھی کم درجہ کا تھا یہی نہیں بلکہ کمیٹی میں ان کی حیثیت باضابطہ ملازم کی نہیں بلکہ ایک ورک چارج ملازم کی تھی جسے کسی بھی وقت نوکری سے جواب دیا جا سکتا تھا لیکن زخم صاحب سے صدارت کے لئے میری درخواست ان کے شاعرانہ منصب کے پیش نظر تھی۔ دوسرے میں چاہتا تھا کہ اعلیٰ حکام بالخصوص کمشنر میونسپل کمیٹی کے اس پیادے کی شاعرانہ عظمت سے واقف ہو سکیں بہرحال زخم صاحب کو بہ اصرار مسند صدارت پر بٹھا دیا گیا اور اس روز سچ مچ انہوں نے مشاعرہ لوٹ لیا لوگوں نے محسوس کیا کہ ادبی محفلوں میں صدارت کا اعزاز واقعی بلند پایہ ادیب یا شاعر حضرات ہی کا حق ہے اس واقعہ کا بالواسطہ یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ آئندہ چند ہی دنوں میں کمشنر خیرپور نے زخم صاحب کے لئے میونسپل کمیٹی میں بہتر اور مستقل منصب پر تقرری کے احکام جاری کر دیئے۔ میرا حافظہ اگر غلطی نہیں کر رہا تو یہ شعر غالباً زخم صاحب ہی کا ہے جو ان کے حسب احوال تھا۔۔۔

کچھ اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں میری سادہ لوحی نے
کہ اب انساں سے پہلے ظرف انساں دیکھ لیتا ہوں

ممتاز کالونی ہی میں میرے مکان کے قریب ڈائریکٹر ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن آغا ساحل قزلباش رہتے تھے بڑے ثقہ انسان تہذیب و شائستگی کے پیکر اور شاعر۔ آغا صاحب سے میرے خصوصی مراسم تھے۔ آغا صاحب مشاعرہ میں شعر پڑھتے تو ان پر

ایک عجب وارفتگی کا عالم طاری ہو جاتا۔ آغاز کلام بڑے طمطراق سے کرتے اور خیرپور کے مخصوص ماحول میں واہ واہ کا جتنا شور بلند ہوتا اتنا ہی آغا صاحب کا جوش و خروش بڑھتا جاتا ایک مرتبہ تو شکار پور کے ایک مشاعرہ میں رات کے بارہ بجے جب آغا صاحب کی باری آئی تو مشاعرہ میں بعض منچلے نوجوانوں نے "داد" کے نام پر وہ ہنگامہ برپا کیا کہ سڑک پر جو پولیس والے گشت کر رہے تھے وہ گھبرا کر مشاعرہ گاہ میں آگئے دلچسپ بات یہ ہے کہ لوگ جتنا شور مچا کر داد دیتے آغا صاحب اتنا ہی خوش ہوتے یہ صورت حال ہم چند لوگوں کے لئے بڑی پریشان کن تھی کیونکہ داد دینے کے لئے حلق اور پھیپڑوں کی ورزش درکار تھی اور اگر داد نہ دیتے تو آغا صاحب کو ناراض کرنا بھی ہمارے بس میں نہ تھا چنانچہ تعظیم صاحب نے اس مسئلہ کا حل یہ نکالا کہ "داد و بیداد" کے ہنگامے میں جب آغا صاحب کی نظر ان پر پڑتی تو وہ صرف تیز تیز لب ہلاتے اور ہاتھ کے اشارے اس طرح کرتے جیسے واہ۔ واہ۔ سبحان اللہ اور مکرر ارشاد کہہ رہے ہوں۔ کیونکہ اس ہنگامے میں جب آغا صاحب غزل پڑھ رہے ہوں تو کان پڑی آواز تک سنائی نہ دیتی تھی۔ یہ نسخہ اس قدر کامیاب ثابت ہوا کہ اس پر میں نے اور بعض دوسرے احباب نے بھی کئی بار عمل کیا آخر ایک بار میں نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ شعر پڑھتے وقت جو کیفیت آپ پر طاری ہوتی ہے وہ تو ہم نے دیکھ ہی لی ہے یہ بتایئے کہ شعر کہتے وقت آپ کی کیا حالت ہوتی ہے کہنے لگے بس نہ پوچھیے میری ازدواجی زندگی اگرچہ ہمیشہ نہایت خوشگوار رہی ہے لیکن میری شعر گوئی نے اس میں تلخی گھول دی ہے میں جب شعر کہتا ہوں تو گھر میں بھاگا بھاگا پھرتا ہوں اور یہی بات میری بیگم کو خار گزرتی ہے اس کے علاوہ میرے اور ان کے درمیان کبھی اختلاف نہیں ہوا۔

آخری شاعر

خیرپور اور سکھر کے درمیان صرف چودہ میل کا فاصلہ تھا چنانچہ یہ جغرافیائی فصل بھی دونوں شہروں میں آئے دن ہونے والی علمی ادبی اور سماجی تقریبات نے پاٹ

دیا تھا سکھر میں مہرالٰہی شمسی صاحب (مدیر روزنامہ کلیم) ایسی محفلوں کی جان سمجھے جاتے تھے بلکہ سکھر میں جتنی بھی اہم ادبی تقریبات بالخصوص مشاعرے وغیرہ ہوتے ان کے اہتمام کا سہرا ہمیشہ شمسی صاحب ہی کے سر ہوتا انہوں نے حسب عادت اصرار کر کے ایک بار (۱۹۶۸ء) سکھر میں ہونے والے ایک کل پاکستان مشاعرہ کا سٹیج میرے حوالے کر دیا صدارت جناب جوش ملیح آبادی کو کرنا تھی اور وہ جناب آغا ساحل قزلباش کے مہمان اس لئے بھی تھے کہ ڈائریکٹر ایکسائز ہونے کی حیثیت سے جوش صاحب کے مناسب "خورو نوش" کا انتظام کرنا ان کے لئے قدرے آسان تھا۔ مشاعرہ آٹھ بجے شروع ہونا تھا لیکن جوش صاحب کے انتظار کے باعث ساڑھے نو بجے شروع ہوا اور جوش صاحب پھر بھی نہ پہنچے بہرحال فیض احمد فیض صاحب کی عبوری یا عارضی صدارت میں کارروائی کا آغاز کر دیا گیا جوش صاحب حسب معمول نصف شب کے لگ بھگ مشاعرہ گاہ میں پہنچے۔ شاعر انقلاب کے آتے ہی پوری محفل احتراماً" کھڑی ہو گئی اور وہ خود ہی مسند صدارت پر فیض صاحب کے پہلو بہ پہلو جا بیٹھے فوراً" ہی کراچی کے اکثر شاعروں نے جوش صاحب کے گرد حلقہ بنا لیا تاکہ "مصرعے اٹھانے" کا فرض بجا لائیں لوگ جانتے ہیں کہ جوش ملیح آبادی کسی ایسی محفل میں شرکت پسند نہ کرتے تھے کہ جس کے آخری شاعر وہ خود نہ ہوں اور اس محفل میں ان کے مصرعے دھرانے والوں کا ایک غول بیابانی موجود نہ ہو مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں "مہندی" نام کی ایک فلم دیکھی تھی جس میں ایک محفل مشاعرہ دکھائی گئی تھی اور اس کے صدر جگر مرحوم تھے چنانچہ مشاعرہ کے آخری شاعر کی حیثیت سے جب جگر صاحب اپنا کلام سنا چکے اور محفل کے اختتام کا اعلان کیا جا چکا تو دکھایا گیا کہ جوش صاحب تشریف لائے اور اپنا کلام سنایا اس طرح فلمسازوں نے نہایت خوبصورتی سے آداب محفل کو بھی نبھایا اور جوش صاحب کی انا کو بھی ٹھیس نہ پہنچنے دی لیکن سکھر میں مجھے اپنی مشکل کا کوئی حل نظر نہ آتا تھا کیونکہ میں خود بھی اس بات پر تیار نہ تھا کہ فیض صاحب کی صدارت کے خاتمے کا اعلان کروں یا صدر محفل کے بعد خواہ جوش صاحب ہی کیوں نہ ہوں کسی اور شاعر کو پڑھواؤں اور ہمیشہ سے قائم ایک شائستہ روایت کو اس طرح توڑ دوں دوسری طرف مجھے اس بدمزگی کا بھی احساس تھا جو جوش

صاحب کو فیض صاحب سے پہلے دعوت کلام دے کر پیدا ہو سکتی تھی غرض میری پریشانی کا اندازہ مجھ سے زیادہ منتظمین محفل اور خاص طور پر خود شمسی صاحب کو تھا۔ چنانچہ وہ لمحہ آ پہنچا جو ایک نہایت خوبصورت اور یادگار محفل شعر و سخن کا اینٹی کلا ئمکس بھی ثابت ہو سکتا تھا کہ اچانک میرے ذہن پر ڈاکٹر تاثیر مرحوم کی مشہور نظم "ید بیضا" کا ایک شعر "نازل" ہوا جسے میں نے چند جملوں کی تمہید کے بعد پڑھا

شکار ماہ کہ تسخیر آفتاب کروں
میں کس کو ترک کروں کس کا انتخاب کروں

اور اس کے ساتھ ہی میں نے مائک جوش و فیض کے درمیان رکھ دیا چنانچہ فیض صاحب خود ہی کھڑے ہو گئے اور صدر محفل ہونے کے باوجود جوش صاحب سے پہلے اپنا کلام سنا کر اس محفل مشاعرہ کو یادگار بنا گئے۔

مفید عام اسکول گلاؤٹھی

ماضی کی یاد جب طوفان بن کر امڈتی ہے تو ذہن خود بخود واقعات کے تند و تیز دھاروں کے ساتھ بہہ نکلتا ہے بظاہر ان واقعات میں ربط یا تسلسل دکھائی نہیں دیتا لیکن ان کی مجموعی چھاپ پھر بھی انسان کی زندگی کو ایک رخ عطا کر جاتی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ بچپن ہی سے بعض حالات و واقعات کے نتیجہ میں جو لاکھ بے ربط و منتشر سہی میری فکر کو ایک مخصوص نہج میسر آئی۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات کی گہما گہمی تھی جس کے نتیجہ میں مسلمانان ہند نے پاکستان کے حق میں اپنا فیصلہ صادر کیا مرحوم لیاقت علی خان میرٹھ کمشنری میں اپنی مہم کے دوران میرے وطن قصبہ گلاؤٹھی تشریف لائے ایک بہت بڑا جلسہ منعقد ہوا اس موقع پر میں نے ترنم سے ایک نظم پڑھی بہت داد ملی بچپن میں سٹیج پر کامیابی کا یہ دوسرا موقع تھا چنانچہ اسکول کی ہر تقریب میں حصہ لینا شروع کر دیا ہمارے قصبے میں مفید عام اسکول کے نام سے

مسلمانوں کی جس تعلیمی درسگاہ کی بنا ڈالی گئی تھی۔ اس کے کارپردازوں میں ہمارے وطن کے ایک بزرگ حافظ شفیع الدین مرحوم میرے والد مرحوم اور میرے تایا زاد بھائی سید اختر عالم واسطی ☆ جنہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے انہی دنوں بی۔ اے پاس کیا تھا پیش پیش تھے میرے والد اور بھائی اختر عالم تو اسکول میں پڑھاتے تھے انہیں کے ساتھ حافظ شفیع الدین صاحب کے بڑے صاحبزادے سید ریاض الدین صاحب بھی ان اساتذہ میں شریک تھے جن کی زندگی کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کی اس درسگاہ کو جلد از جلد بام عروج پر پہنچایا جائے اس جذبہ کو مسابقت نے اور بھی مہمیز لگائی کیونکہ آئے دن ہمارا مقابلہ کھیلوں کیا اور دوسری تقریبات کیا غرض ہر معاملے میں ہندوؤں کے مقامی اسکول سے رہتا تھا جسے ڈی۔ این اسکول (دیوناگری اسکول) کہتے تھے انہین دنوں جب میں ساتوین کلاس کا طالب علم تھا مسلم ہائی سکول بلند شہر میں تمام یو۔ پی کے سکولوں اور انٹر کالجوں کے طلباء کا تقریری مقابلہ منعقد ہوا اس مقابلہ کے لئے جناب ریاض الدین نے مجھے منتخب کیا تقریر لکھ کر دی اور خطیبانہ اداکاری کے ساتھ ایسی زبردست تیاری کرائی کہ لوگ مسلم ہائی سکول بلند شہر کے اس عظیم الشان تقریری مقابلے میں میری "شعلہ بیانی" دیکھ کر عش عش کر اٹھے اور مجھے دوسرا انعام حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہوا ☆

اس کے بعد مجھے والد مرحوم نے آٹھویں جماعت میں مسلم ہائی سکول بلند شہر ہی میں داخل کروا دیا جہاں مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا پہلے سے میری بڑھی ہوئی ہمت نے میری اور بھی رہنمائی کی اور میں سکول کی مجلسی زندگی میں بہت جلد گھل مل گیا اصل میں ان دنوں مسلمانوں کے ایسے اداروں میں تعلیم و تربیت کا ایک مخصوص انداز نمایاں ہوتا تھا جس کا مرکز و محور پاکستان کا نصب العین تھا دوسری طرف میرے

☆ اختر واسطی صاحب کا انتقال کراچی میں ۱۹۸۴ء میں ہوا وہ ایک عظیم الشان تعلیمی درسگاہ (موفسری) اپنی یادگار کے طور پر چھوڑ گئے ہیں اور وہیں مدفون ہیں۔ منصور عاقل

☆ تیسرا انعام مشہور اردو لغت فرہنگ عامرہ کے مصنف عبداللہ خویشگی کے صاحبزادے ولی اللہ خویشگی کو ملا جو اس وقت این۔ آر۔ ای۔ سی۔ کالج خورجہ کے طالب علم تھے اور جو کئی سال سعودی عرب میں پاکستان کے سفیر رہنے کے بعد آج کل مصر میں سفیر ہیں۔ منصور عاقل

خاندانی ماحول پر ادب اور مذہب ہی کی واضح گرفت تھی بزرگوں میں جید علما بھی تھے اور نامور ادیب و شاعر بھی میرے ماموں سید شبیر حسن مرحوم جو حسن نیازی کے قلمی نام سے لکھا کرتے تھے ایک بلند پایہ انشاء پرداز تھے میرے ایک اور ماموں ظفر نیازی مرحوم جو میری والدہ کے خالہ زاد بھائی تھے خواجہ حسن نظامی مرحوم سے قرابت کے باعث ان کے اسلوب نگارش سے بہت متاثر تھے دھلی سے مدتوں ایک ماہانہ مجلّہ "کامیاب" نکالتے رہے۔ اور پاکستان کے قیام کے بعد کراچی سے ماہنامہ "نقاد" جاری کیا نقاد نے ملک بھر میں اپنی صحافتی اور ادبی عظمت کا لوہا منوایا جس کا تمام تر سہرا ظفر نیازی مرحوم کی تجزیہ نگاری اور ایک تیکھے اندازِ طنز کی حامل منفرد تحریروں کے سر تھا۔

میں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے قصبہ میں مشاعروں کی گونج سنی۔ جناب مشتاق حسین مضطر اور سید امیر حسن امیر گلاؤٹھی کے ان شعراء میں سے تھے جنہیں اپنے عہد کے غزل گو شعراء میں نمایاں مقام حاصل تھا خدا معلوم کہ ان حضرات کا کلام اگر محفوظ بھی ہے تو کس حال میں ہے۔ میانوالی کے دوران قیام کالج لائبریری میں ایک کتاب "ترکش" میری نظر سے گزری جسے احسان دانش مرحوم نے مرتب کیا تھا اور جس میں برصغیر کے ممتاز غزل گو شعراء کا انتخاب کلام درج تھا اسی کتاب میں میں نے جا بجا ان بزرگوں کے اشعار پڑھے بلکہ اپنے نانا مرحوم جناب فدا کے یہ دو شعر میرے حافظہ کا مستقل سرمایہ بن گئے ہیں۔

ہوا ہے کون سرگرم تبسم   کہ پھولوں کو پسینہ آ رہا ہے
مری چھوٹی ہوئی نبضوں سے پوچھو   کہ ان کے ہاتھ سے کیا جا رہا ہے

ان کے علاوہ میری ننھیال کے ایک بزرگ جناب ناطق گلاؤٹھوی نے غزل اور ادبی تنقید دونوں میدانوں میں وہ نام پیدا کیا کہ آج بھی کسی ادبی مورخ کے لئے یہ ممکن نہیں کہ ان سے صرف نظر کر سکے ناطق صاحب کی عمر کا بیشتر حصہ ناگپور (سی - پی) میں گزار جہاں وہ لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن بھی رہے۔

لاہور کی یادیں

شعور و لاشعور کے اس تربیتی پس منظر کے ساتھ جب میں ۱۹ جنوری ۱۹۴۸ء
کو پاکستان آیا تو اس وقت میری عمر تقریباً چودہ سال تھی۔ لاہور مسکن ٹھہرا اور تقدیر
کے اس فیصلہ نے میرے مستقبل کے رجحانات کا تعین کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔
لاہور کی علمی تہذیبی اور ثقافتی عظمت میرا گہوارہ بن گئی۔ ۱۹۴۹ء میں میٹرک کا امتحان
امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ میرے ہم جماعتوں میں شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی
مرحوم کے صاحبزادے ارشد اللہ خاں عرشی بھی تھے۔ یہ لڑکا جتنا منچلا اتنا ہی ذہین بھی
تھا۔ اس کے علاوہ اپنے والد کے شمس العلماء ہونے کا تفاخر چھپائے نہ چھپتا تھا یہ
حضرت ایسے ویسوں کو گھاس بھی نہ ڈالتے لیکن کچھ عرصہ تناؤ رہنے کے بعد میرے
ساتھ خوب گاڑھی چھننے لگی۔ اک روز مجھے اپنے گھر لے گئے ان دنوں یہ لوگ دیال
سنگھ پبلک لائبریری کی بالائی منزل میں رہتے تھے اور مولانا تاجور دیال سنگھ کالج میں
پروفیسر تھے۔ عرشی نے مولانا سے میرا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ منصور میرے دوست
اور ہم جماعت ہیں اور شاعر بھی ہیں۔ شاعر اس لئے بتایا کہ سکول میں میں نے عرشی
کے نخوت آمیز رویہ سے تنگ آ کر ایک ہجو لکھ کر لڑکوں میں عام کر دی تھی جس کا
اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا تھا اور یہی حرکت بالآخر ہماری دوستی کی بنیاد بن گئی تھی
بہر حال مولانا نے جب یہ سنا کہ میں "شاعر" ہوں تو مجھے ایسے گھور کر دیکھا کہ میں
سہم گیا پھر فرمایا اچھا اپنے کچھ شعر سناؤ مولانا کے تیور دیکھ کر مرا حافظہ جواب دے گیا
تھا لیکن عرشی نے ہمت بندھائی تو میں نے ابھی تین چار شعر ہی سنائے تھے کہ مولانا
فرمانے لگے یہ کیا خرافات بک رہے ہو۔ میں پشیمان سا ہو کر رہ گیا لیکن فوراً ہی ان کا
رویہ شفقت میں بدل گیا کہنے لگے بیٹے تم ماشاء اللہ ذہین ہو اور ایسا لگتا ہے کہ شعر و
ادب کا خوب مطالعہ کرتے ہو اول تو تمہیں اس عمر میں صرف مطالعہ بلکہ اپنی نصابی
سرگرمیوں ہی پر توجہ دینا چاہیے لیکن اگر شاعری کا شوق ناگزیر ہی ہے تو بات ایسے کہو
کہ دوسرے کی سمجھ میں آجائے بلکہ دل میں اتر جائے اس کے لئے اسلوب بیان سادہ
اور دلکش ہونا چاہیے لیکن آپ تو مشکل لفظوں اور اضافتوں کے بڑے دلدادہ معلوم

ہوتے ہیں۔ مولانا نے اسی وقت میرے شعروں میں معمولی سا لفظی رد و بدل کیا اور مجھ سے کہا کہ اب سنایئے مجھے محسوس ہوا کہ میں واقعی ایک بہت بڑی حماقت میں مبتلا تھا مولانا کی اصلاح نے شعر کے صحیح تصور کو میرے ذہن میں روشن کر دیا۔

بات دراصل یہ تھی کہ میٹرک کا امتحان دینے کے فوراً بعد مکمل فرصت تھی میرے پڑوس ہی میں ایک صاحب ادیب عالم کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے روز میرے پاس آجاتے کبھی مولانا حسرت موہانی کی "نکات سخن" اٹھا لاتے اور کبھی مولانا آزاد کی "آب حیات" انہوں نے اپنے ساتھ مجھے بھی کج بحثی کا خاصا عادی بنا لیا تھا تاہم ان کی نصابی کتب سے میری واقفیت ان کی نسبت کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی میں نے چاہا کہ میں بھی یہ امتحان کیوں نہ دے ڈالوں امتحان میں ابھی تقریباً ایک ماہ باقی تھا میں نے فیس جمع کرا دی میں تو امتحان میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گیا لیکن جس کی وجہ سے مجھے یہ تحریک ملی تھی وہ بیچارہ فیل ہو گیا۔ مطالعہ کے دوران اساتذہ پر خوب توجہ دی اور غالب کے مشکل اشعار کو اپنے لئے نمونہ کمال بنا لیا بلکہ اکثر ایسا ہوتا کہ اساتذہ کی زمینوں میں شعر کہنے کی کوشش کرتا ظاہر ہے کہ میری بساط ہی کیا تھی نتیجہ کے طور پر مولانا تاجور سے ڈانٹ کھائی یہ الگ بات کہ گمراہی نے راستہ دکھا دیا۔

میں مولانا تاجور کی شخصیت اور ان کے تبحر علمی سے بیحد متاثر ہوا تھا چنانچہ شوق کشاں کشاں دیال سنگھ کالج لے گیا حالانکہ اولاً میں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا تھا انہیں دنوں دیال سنگھ پبلک لائبریری کی بالائی منزل کے ہال میں جو نہایت عمدہ فرنیچر سے آراستہ تھا انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس ہوا کرتے تھے میں عرشی کے ساتھ اکثر ان اجلاسوں میں شرکت کرتا وہاں ترقی پسند تحریک کی اکثر نامور شخصیتوں کو قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ کچھ ہی دنوں بعد حکومت نے انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی عائد کر دی اس دوران میرا ادبی دوستوں کا ایک حلقہ بن گیا تھا چنانچہ ہم نے انجمن تنقید ادب کے نام سے ایک ادبی جماعت تشکیل دے ڈالی اور اس کے ہفتہ وار اجلاس انجمن ترقی پسند مصنفین والے ہال میں باقاعدگی سے منعقد کرنے شروع کر دیئے اس جماعت کی سیکرٹری شپ کے لئے سید مظفر ضیاء ہاتھ آئے اور وہ اس طرح کہ ان سے میرا پہلا تعارف ۱۹۴۹ء میں اپنے ایک رشتے کے

بھائی سید عرفان حسن واسطی مرحوم کی شادی کی تقریب میں ہوا جو ماڈل ٹاؤن لاہور میں منعقد ہوئی تھی۔ اس وقت وہ صرف مظفر احمد کہلاتے تھے اور کیونکہ افسانے لکھنے کا شوق تھا اس لئے قلمی نام مظفر عالم استعمال کرتے تھے۔ "عالم" اس لئے کہ ان دنوں وہ اپنے ایک ہم عصر اور ہم وطن عزیز عالم سے بہت متاثر تھے جو بمبئ (انڈیا) سے "عبرت" نامی ایک ادبی ماہنامہ نکالتے تھے اتفاق سے عزیز عالم صاحب کو میں بھی جانتا تھا وہ ہمارے وطن قصبہ گلاوٹھی حصول تعلیم کے سلسلہ میں آئے تھے لیکن کٹر کانگریسی اور سوشلسٹ ذہن کے مالک تھے مظفر صاحب کے اسلامی ذہن پر ان کا جادو زیادہ عرصہ نہ چلا اور ہم نے دیکھا کہ ایک دن مظفر ضیاء کے نام سے ایک غزل روزنامہ مغربی پاکستان لاہور کے علمی و ادبی ایڈیشن میں چھپی ہوئی ہے اس ایڈیشن کو مرحوم مراتب علی تائب ترتیب دیا کرتے تھے اور مرتضیٰ ملیخان میکش مرحوم اخبار کے مدیر شہیر تھے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس غزل کے ذریعہ ہمیں مظفر صاحب کے ضیاء ہونے ہی کا علم نہیں ہوا بلکہ ان کے شاعر ہونے کا بھی انکشاف ہوا چنانچہ انجمن تنقید ادب کی سیکرٹری شپ ان کے گلے کا ہار بن گئی وہ تنقیدی اجلاسوں کی بڑی خوبصورت روئیداد مرتب کرتے جسے ان کے ادبی رجحان کی مناسبت سے "افسانہ و شعر" کا حسین امتزاج قرار دیا جا سکتا تھا۔ دراصل یہ انجمن میرے لئے ہی نہیں بلکہ میرے حلقہ احباب میں اکثر کے لئے ایک نہایت موثر ادبی تربیتی پلیٹ فارم ثابت ہوئی۔ ہمارے آئے دن کے ادبی ہنگاموں میں شریک ہمارے ایک اور دوست سید زاہد حسین سالک پانی پتی تھے جو سخت منشی فاضل قسم کے آدمی تھے ان کی تنقیدی باریک بینی سے ہم کبھی کبھی بڑے عاجز آجاتے لیکن سالک صاحب کے ادب سے لگاؤ اور دوستوں سے محبت کا ہمارے دل میں بے حد احترام تھا ایک اور دوست شاہین کرنالی جو سیاہ فام ہونے کے باوجود اجلے دل کے انسان تھے۔ اچھے افسانے لکھتے لیکن مجھے ان کی شاعری زیادہ بھلی لگی اور یہ شعر تو میرا حافظہ شاید کبھی فراموش نہ کر سکے۔

ہمارا حال نہ پوچھو تم اپنی بات سناؤ
خوشی میں بھی نکل آتے ہیں آنسوؤں پہ نہ جاؤ

☆ شاہین کرنالی لاہور میں اور سالک صاحب ملتان میں ہیں لیکن یہ ملاقاتیں اب خواب بن چکی ہیں البتہ یادوں کو سدا بہار اور محبتوں کو لازوال بنانے والے میرے ایک بچپن کے ساتھی شاہد برنی ہیں جنہیں اللہ نے خلوص اور بے لوثی کی دولت سے نواز کر ہر طرح کی متاع دنیوی سے بے نیاز کر دیا۔ مجھے اس بندہ درویش کی دوستی پر فخر ہے۔ حبیب الرحمٰن خان شیروانی مرحوم کے ذہن میں غالباً" کوئی ایسا ہی عظیم کردار ہو گا کہ انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو ایک خط میں لکھا تھا۔

"خلوص سدا بہار ہے اور اس ہنگامہ ہستی میں یہی اک نعمت ابدی ہے"

لاہور کو ایک اور رنگ میں دیکھنے کا موقع مجھے اس وقت میسر آیا جب میں خیرپور سے تبدیل ہو کر ۱۹۵۹ء کے نصف آخر میں یہاں آیا محکمہ تعلقات عامہ کا صوبائی دفتر ۲۱۔ ایبٹ روڈ پر واقعہ تھا۔ محمود نظامی مرحوم ڈائریکٹر تھے بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ بنیادی طور پر چونکہ اہل قلم تھے اس لئے افسری کو پاس بھی نہ پھٹکنے دیتے میں اپنے چند رفقائے کار کے ساتھ ایک بڑے سے کمرے میں بیٹھتا تھا یہاں کچھ دیر کے لئے تقریباً روز ہی محفل گرم ہوتی اور نظامی صاحب بھی کبھی کبھی آ شریک ہوتے ان دنوں انفارمیشن افسروں میں مرحوم ہوش ترمذی اور سجاد رضوی بھی شامل تھے باہر سے آنے والے لوگوں میں سب سے دلچسپ شخصیت مشکور حسین یاد تھے۔

یاد صاحب اپنے انشائیوں کے لئے تو مشہور ہیں ہی غزل میں بھی دسترس رکھتے ہیں چاہیں تو فارسی میں بھی قادرالکلامی کا دعویٰ کر دیں مگر میں نے انہیں کبھی اوچھی باتیں کرتے نہیں دیکھا۔ البتہ ایسا کبھی نہ ہوتا کہ وہ آئیں اور دو اک ایسے لطیفے نہ سنا جائیں جن کا براہ راست ان کی ذات سے تعلق ہو۔ ایک مرتبہ صبح ہی صبح گھر

☆ شاہین کرنالی کا نام ثناء اللہ تھا جسے بہت کم لوگ جانتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے اپنا تخلص بھی تبدیل کر لیا۔ اب وہ اظہار شاہین کے نام سے پہچانے جاتے ہیں ان کا شعری مجموعہ "دیوار میں در" شائع ہو چکا ہے۔

سے نکلے راستے میں ایک تیز رفتار شخص نے ان سے آگے نکلتے ہوئے وقت پوچھا تو انہوں نے گھڑی دیکھ کر بتایا کہ آٹھ بجے ہیں یہ سن کر وہ شخص گھبراہٹ میں اور تیز ہو گیا بلکہ دوڑنے لگا فوراً ہی بعد یاد صاحب نے گھڑی دوبارہ دیکھی تو آٹھ نہیں سات بجے تھے چنانچہ انہوں نے اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا اور دو فرلانگ پر اسے جا لیا اور کہا کہ بھائی مت دوڑو آٹھ نہیں سات بجے ہیں یہ واقعہ لطیفہ سہی لیکن مشکور حسین یاد کی معصوم اور والہانہ شخصیت کا آئینہ دار ہے۔

لاہور کے ادیب اور شاعر لاہور کے قہوہ خانوں کو "رونق بخشنے" کے لئے ہمیشہ سے مشہور ہیں۔ لاہور کا پاک ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس ایک ہی روایت کے دو نام ہیں کہتے ہیں ان کے بیرے بھی بڑے باذوق ہوتے ہیں۔ حافظ لدھیانوی نے مجھے مولانا چراغ حسن حسرت کا ایک واقعہ سنایا جو لطیفہ کی شکل میں ختم ہوا۔ مولانا احباب کے ساتھ بیٹھے تھے کہ چائے آنے میں دیر ہوئی انہوں نے غصے کے عالم میں سامنے ہی کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص سے شکایت کی اس نے ہال کے دوسرے سرے پر کھڑے ہوئے بیرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا سے پوچھا کہ آپ نے اس سفید بالوں والے بیرے کو تو آرڈر نہیں دیا تھا مولانا کی رگ ظرافت پھڑکی اور جواب دیا !

"نہیں ! جب آرڈر دیا تھا تو بال سیاہ تھے"

بہرحال مجھے افسوس ہے کہ ٹی ہاؤس یا کافی ہاؤس میں بیٹھنے والوں کے بارے میں مجھے کبھی کوئی اچھی رائے قائم کرنے کا موقع نہ ملا اس میں کوئی شک نہیں کہ ان جگہوں پر اکثر دانشوروں اور اہل قلم لوگوں کا ہجوم لگا رہتا بعض تو چھ چھ اور آٹھ آٹھ گھنٹے بیٹھتے اور اس تمام وقفے میں وہ آٹھ آنے کا صرف ہاف سیٹ ہی منگواتے کچھ ایسے بھی ہوتے کہ ایک پیسہ خرچ کئے بغیر چائے پیتے رہتے اور لوگوں کو شرف میزبانی بخشتے رہتے۔ بہرحال مجھے دکھ جس بات کا ہوا وہ یہ کہ ان میں اکثر حضرات منافقت اور ریاکاری کے عادی تھے موضوع سخن اکثر غیر موجود لوگوں کی عیب جوئی ہوتا موجود لوگوں کے "حسن کلام" کی داد دی جاتی اور جب وہ اٹھ کر چلے جاتے تو انہیں جاہل اور احمق گردانا جاتا۔ جب کہ ہر شخص خود کو ارسطو سے کم سمجھنے پر تیار نہ تھا۔ بقول جمیل مظہری مرحوم---

بقدر پیانہ تخیل خمار ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

لائلپور میں ادب و صحافت کا ماحول۔

جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں لائلپور میں جسے اب فیصل آباد کہا جاتا ہے میرا قیام رہا۔ یہ شہر اپنی خصوصیات کے اعتبار سے منفرد ہے شہر اور دیہات دنوں ہی کا ماحول اس شہر میں نظر آتا ہے۔ انفارمیشن کے محکمے میں ملازمت کے حوالے سے میرا زیادہ تر تعلق صحافی حضرات سے رہا لیکن چونکہ ادب اور صحافت کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے صحافیوں ہی میں ادیب اور شاعر بھی شامل تھے۔ اور ایک ایسی واحد شخصیت جس میں ادب و صحافت بیک وقت مرتکز نظر آئے وہ خلیق قریشی مرحوم تھے۔ قریشی صاحب بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے تحریک پاکستان میں صحافی کی حیثیت سے حمید نظامی مرحوم کے شانہ بشانہ حصہ لیا اور ادب وصحافت کے میدان میں ہمیشہ لائلپور کی آبرو سمجھے گئے بطور صحافی ان سے میرے مراسم ابتداء میں قدرے کشیدہ رہے اور وہ اس لئے کہ مقامی صحافی حضرات دفتر اطلاعات پر مسلسل اپنی برتری قائم رکھنے کے عادی ہوچکے تھے جسے میں برابری کے برادرانہ تعلقات میں تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ مقامی انتظامیہ کے حوالے سے بھی مجھے قدرے دشواری پیش آئی کیونکہ اس کے سربراہ ڈپٹی کمشنر جناب قاسم رضوی مرحوم تھے۔ جو ایک نہایت باصلاحیت افسر اعلی ذہنی و قلبی صفات کے حامل انسان تھے۔ ضلع کے نہ صرف انتظامی معاملات پر انکی گرفت نہایت مضبوط تھی بلکہ لائلپور کی تمام معاشرتی زندگی ان کے گرد گھومتی تھی وہ عوام الناس، سیاسی قائدین، صحافتی و ادبی حلقوں اور انتظامیہ کی ہر سطح پر بے حد مقبول تھے چنانچہ مجھ ایسے نووارد کے لئے ایسی پہاڑ جیسی شخصیت سے نمٹنا آسان کام نہ تھا۔ البتہ اسے میری خوش قسمتی کہیئے کہ مجھے جلد ہی ان کی شفقت حاصل ہوگئی جس کا بنیادی سبب اس وقت کے حالات میں غالبا" یہ تھا کہ ہم دونوں ہی اخبارات سے کھنچاو سے پاک اور خوشگوار تعلقات رکھنا چاہتے تھے اس سلسلہ میں انھوں نے میری بھرپور رہنمائی کی اور میں نے ضلعی امور کی نشرو اشاعت میں جو خدمات انجام دیں انہیں رضوی صاحب نے نہ صرف سراہا بلکہ میری ذات کا یہ تاثر انکے ذہن میں ہمیشہ جاگزیں رہا۔ چنانچہ لائلپور سے جانے کے بعد امریکہ سے ایک تربیتی کورس سے واپسی پر جب انکا تقرر بحیثیت ڈائریکٹر جنرل تعلقات عامہ وزارت اطلاعات و نشریات میں ہوا

لائلپور کے ایک کل پاکستان مشاعرہ میں غزل پڑھتے ہوئے۔ انتہائی بائیں سید محمد قاسم رضوی (صدر مشاعرہ) پس منظر میں شیر افضل جعفری اور حبیب جالب نظر آرہے ہیں

(۱۹۶۲ء)

تو اس وقت میں لائلپور سے تبدیل ہو کر پشاور جا چکا تھا جہاں میرے ساتھ ایک عجیب و غریب واقع پیش آیا اور اگر رضوی صاحب مرحوم میری کارکردگی کے مداح نہ ہوتے تو شاید مجھے اپنی ملازمت ہی سے ہاتھ دھونا پڑتے۔ ہوا یوں کہ ۱۹۶۴ء میں مرحوم فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے صدارتی الیکشن کی مہم زوروں پر تھی اور اس وقت میں پشاور میں قائمقام ڈائریکٹر انفارمیشن تھا۔ صوبہ مغربی پاکستان کے وزیر مال جناب پیر محمد خاں پشاور دورے پر آئے اور نوشہرہ میں انہوں نے ایک سیاسی جلسہ سے خطاب کیا۔ بحیثیت وزیر انکی پبلسٹی کا اہتمام کرنا میرا فرض منصبی تھا لیکن سیاسی جلسہ کی کوریج میرے فرائض میں شامل نہ تھی ویسے بھی اس جلسہ کی علی الاعلان سرکاری تشہیر کرنا خود ان کے حق میں مناسب نہ تھا چنانچہ میں نے ایک انفارمیشن آفیسر کو ان کے ساتھ مامور کیا اور یہ ہدایت کر دی کہ وہ سیاسی جلسہ کی کاروائی کے بارے میں کوئی سرکاری ہینڈ آوٹ جاری نہ کریں بلکہ مقامی پریس کے نمائندگان کو وہاں لے جائیں تاکہ وہ براہ راست سیاسی جلسہ کی کوریج کر سکیں۔ لیکن ہوا یہ کہ وزیر صاحب کے استفسار پر انفارمیشن آفیسر نے انھیں بتایا کہ نئے ڈائریکٹر انفارمیشن نے اسے جلسہ کی کوریج سے منع کر دیا ہے اور یہ نہیں بتایا کہ یہ تمام انتظام مقامی پریس کے ذریعہ کر دیا گیا ہے چنانچہ چند ہی دن بعد ایک اعلی سطح کا اجلاس جب اسلام آباد میں ہوا اور جسکی صدارت صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم نے کی اس میں وزیر مال پیر محمد خاں صاحب نے میری شکایت کی اور فوری طور پر ملازمت سے میری معزولی کا مطالبہ کیا حسن اتفاق سے اس اجلاس میں قاسم رضوی صاحب مرحوم خود موجود تھے انہوں نے میرا نام سنتے ہی غلط فہمی کا ازالہ کیا اور اس طرح

"رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت"

میں لائلپور میں ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۴ء تک کم و بیش تین سال رہا بڑے اچھے اور محبت والے لوگوں سے تعلق رہا جن کی یادیں ہمیشہ میرے ذہن میں محفوظ رہیں گی۔ صحافیوں سے آئے دن کا سرکاری تعلق بھی ذاتی مراسم سے عبارت ہو گیا اور شہر کے علمی و

ادبی حلقوں نے گویا لازوال خوشگوار یادوں کا انمول خزینہ میری جھولی میں ڈال دیا آئے دن مشاعرے اور محفلیں جمتیں جن کی قہقہہ بار فضا آج بھی میرے ذہنی افق کو جگمگائے ہوئے ہے۔ ان دنوں ہفتہ وار چھٹی اتوار کو ہوتی تھی چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ پروفیسر منظور حسین شور جنہیں میں بچپن سے شور علیگ کے نام سے جانتا تھا اکثر تشریف لے آتے ان کے ہمراہ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل پروفیسر کرامت حسین جعفری ہوتے اور اس طرح کچھ اور احباب کی معیت میں چھٹی کا تمام دن شعر و شاعری علمی و ادبی بحثوں میں گذر جاتا شور صاحب کی شاعرانہ عظمت کے راز مجھ پر انھی دنوں میں منکشف ہوئے مجھے سب سے زیادہ ان کے والہانہ پن نے متاثر کیا وہ شاعر بھی تھے اور مکمل شعر بھی نہایت خوبصورت شخصیت کے مالک اور اردو و فارسی زبان و ادب پر حاکمانہ قدرت مگر بے نیازی کا یہ عالم کہ فکر شعر کے علاوہ دنیا و مافیہا سے اکثر و بیشتر بے خبر رہتے۔ اکثر شہر میں سائیکل کی سواری کرتے اس طرح دیکھا گیا کہ ان کا خیریت سے گھر پہنچ جانا اک معجزہ ہی ہوتا تھا ایک مرتبہ لائلپور کے کاٹن مل والے مشاعرے میں ملک بھر کے جو شعراء آئے ان میں سے بعض نے میرے پاس قیام کیا مشاعرہ کی اگلی صبح چند دوست جن میں قتیل شفائی، کلیم عثمانی اور ہوش ترمذی مرحوم بھی تھے میرے ہمراہ شور صاحب سے ملنے ان کی گوبند پورہ والی رہائش گاہ پر گئے دستک دی تو کسی بچے نے ڈیوڑھی کھول دی اور ہم لوگ بیٹھ گئے چند ثانیوں کے بعد شور صاحب تشریف لائے حسب معمول بال پریشاں لیکن ہوش ترمذی مرحوم نے اشاروں اشاروں میں ہماری توجہ ان کی جس قلندرانہ ادا کی طرف مبذول کرائی اسے دیکھ کر تو ہم سبھی ہنسی روکنے کی شدید اذیت سے دوچار ہو گئے کسی بہانے مجھے ہوش باہر لے آئے اور خوب ہنسے کہ شور صاحب نے قمیض اور پائجامہ دونوں ہی الٹے پہن رکھے تھے البتہ چائے کے لیے جب وہ اندر گئے اور دوبارہ واپس آئے تو لباس درست کر لیا گیا تھا شور صاحب آجکل کراچی میں ہیں اور میرے کراچی کے دوران قیام بھی ان سے اکثر ملاقاتیں رہیں۔ انھیں اب ضعیفی اور بیماری دونوں ہی نے گھیر لیا ہے اللہ تعالیٰ انہیں صحت و تندرستی کے ساتھ زندگی عطا فرمائے (آمین)۔

لائلپور کاٹن مل کا مشاعرہ ایک خوبصورت روایت بن گیا تھا جس کا تسلسل

مجلس اقبال لائلپور کی ایک خصوصی تقریب سے خطاب (۱۹۶۳) صدر محفل یزدانی ملک کے دائیں مرزا محمد منور اور جاوید قریشی اور بائیں جانب پروفیسر افتخار چشتی، پروفیسر کرامت حسین جعفری اور ڈاکٹر وزیر آغا۔ خلیق قریشی عقب میں نظر آ رہے ہیں۔

ہندومالکان کے جذبہ ادب پروری نے تقسیم برصغیر سے پہلے ہی سے قائم رکھا ہوا تھا جس مشاعرے کا میں نے اوپر ذکر کیا اس میں جناب احسان دانش بھی شریک تھے قیام میرے یہاں تھا چنانچہ مجھے ان کی بھی درویشانہ ادا دیکھنے کا موقع ملا ان کے قیام کا بندوبست میں نے گھر کے ایک بیرونی کمرے میں کیا تھا اور حسب توفیق ان کی آسائش کا اہتمام بھی کیا تھا چنانچہ مشاعرہ سے واپسی پر کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں پھر میں اجازت لے کر اندر چلا گیا لیکن چند ہی لمحوں بعد جگ میں پینے کا پانی لے کر جب دوبارہ آیا تو دیکھا کہ احسان صاحب مسہری کے آرام دہ بستر کو چھوڑ کر زمین پر بچھی ہوئی دری پر صرف تکیہ کی آسائش کو ضروری سمجھتے ہوئے سونے کو لیٹ چکے ہیں میں نے حیرت سے پوچھا کہ حضرت یہ کیا تو فرمایا کہ آپ میری زندگی کے اس پہلو سے آشنا نہیں مجھے نیند ہی زمین پر آتی ہے کیونکہ ابتدائی زندگی میں ایک طویل مدت تک پلنگ کی آسائش میسر نہیں آئی اس لیے اسی کا عادی ہو گیا ہوں اللہ اللہ کیا لوگ تھے کہ درویشی میں بھی اقلیم ادب میں عدیم المثال فرمانروائی کر گئے۔

لائلپور کے شعراء میں خلیق قریشی، فیض جھنجھانوی، حافظ لدھیانوی کے علاوہ نوجوان شعراء اور دانش وروں کا ایک پورا حلقہ تھا اور میں اس کا حلقہ بگوش مجلس اقبال شہر کا بہت فعال ادبی ادارہ تھا اس کے علاوہ بھی میرے دوران قیام دو ایک ملکی سطح کے مشاعرے ہوئے جنھوں نے شہر کی ادبی فضا کو مہمیز کرنے کا کام انجام دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میرے یہاں اکثر و بیشتر جو شعری نشستیں ہوتی تھیں ان میں فارسی طرحی مشاعروں کا سلسلہ بھی چل پڑا چنانچہ مجھے زندگی میں پہلی بار فارسی میں شعر کہنے کا تجربہ یہیں ہوا۔ اس تحریک کو چلانے والوں میں پروفیسر شہزادہ حسن ظاہر جو مقامی کالج میں فارسی کے استاد تھے پیش پیش تھے بہر حال جو احباب اس محفل میں رونق محفل کی حیثیت رکھتے تھے ان میں خلیق قریشی مرحوم، حافظ لدھیانوی، صدیق شبلی (جو اب ڈاکٹر صدیقی شبلی ہیں اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں ڈین کے منصب پر فائز ہیں) ارشاد احمد خان، ریاض مجید، نسیم انگر اور اشرف گوہر وغیرہ شامل تھے اب یہ سب دوست ہی بکھر کر رہ گئے ہیں کبھی کسی سے ملاقات ہو جاتی ہے تو اس دور کے لائلپور کو ایسے یاد کرتے ہیں جیسے کوئی شیر خوار بچہ ماں کی گود کو۔

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اشرف گوہر کی شادی ہوئی تو سب دوست براتی بن کر تمام رات ایک بس میں سفر کر کے ساہیوال پہنچے سفر انتہائی تکلیف دہ ہونے کے باوجود قہقہوں اور نت نئے فی البدیہہ اشعار کی گونج میں گذر گیا ایک دوست مصرعہ موزوں کرتا تو دوسرا شعر مکمل کر دیتا اس رات بلا مبالغہ دوستوں نے سوڈیڑھ سو شعر کہہ کر اپنی اپنی طبع موزوں کا لوہا منوایا۔ اور آخر جون ۱۹۶۴ء کی ایک ایسی شام بھی آئی جب بے شمار الوداعی تقریبات کے بعد دوستوں اور مداحوں کے اک ہجوم نے مجھے لائلپور ریلوے اسٹیشن سے آنسوؤں کی لڑیوں کے درمیان پھولوں کے ہار پہنا کر پشاور کے لیے رخصت کیا۔

اہل پشاور کی مہمان نوازی

پشاور تبادلہ ہو کر اگرچہ میں پہلی بار آیا تھا لیکن پشاور دیکھنے کا میرا یہ تیسرا موقع تھا پہلی بار میں پشاور ۱۹۵۹ء میں آچکا تھا ان دنوں میرے بڑے بھائی علامہ سید قابل پشاور ہی میں ڈبگری کے علاقے میں رہائش پذیر تھے اور "غازی سرحد برقی پریس" نام کے ایک طباعتی ادارے کے مالک و منتظم تھے مجھے پشاور یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات میں جو اسی سال قائم ہوا تھا ریڈر کی آسامی پر تقرر کے سلسلہ میں انٹرویو کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ انٹرویو کے لیے قابل بھائی مجھے اپنے ایک مقامی دوست کے ہمراہ یونیورسٹی لے گئے جہاں صرف دو یا تین امیدوار میرے علاوہ موجود تھے انٹرویو کے بعد واپسی پر قابل بھائی کے ہمراہی دوست نے یونیورسٹی سے متعلق کچھ ایسے ایسے عجب واقعات سنائے کہ میں خوفزدہ سا ہو گیا اور اس کے باوجود کے چند دنوں بعد مجھے یونیورسٹی سے تقرر نامہ موصول ہو گیا۔ لیکن یونیورسٹی کی ملازمت اختیار کرنے کے لیے میری ہمت نہ ہوئی اور میں نے معذرت لکھ بھیجی بعد میں معلوم ہوا کہ ان
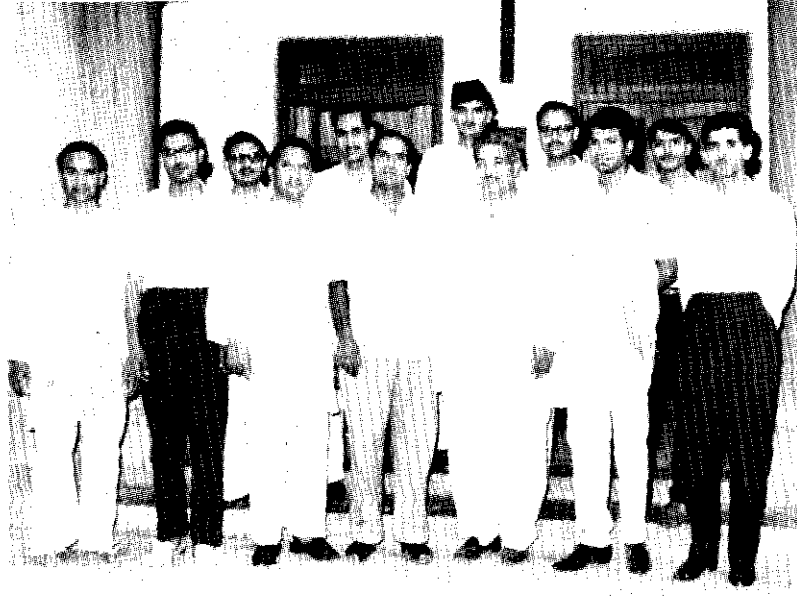
لائلپور کے ادیبوں اور دانشوروں کے ساتھ (۱۹۶۴)

پشاور میں ریڈیو پاکستان کے ایک مشاعرے میں (۱۹۶۴)

صاحب نے نہ جانے کس مصلحت کے تحت مجھے بدظن کیا ورنہ ان کی کسی بات میں کوئی صداقت نہ تھی۔ بہرحال شعبہ تعلیم سے وابستہ رہنے کے لیے مجھے زندگی میں یہ آخری موقع ملا تھا۔ جسکے ضائع ہونے کا مجھے آج تک قلق ہے۔ دوسری بار مجھے پشاور آنے کا اتفاق ۱۹۶۳ء میں ہوا جب مجھے تقریباً ڈیڑھ ماہ تک پشاور کی دیہی ترقیاتی اکیڈمی میں ایک تربیتی کورس کے سلسلہ میں قیام کرنا پڑا۔ راجہ محمد افضل صاحب اکیڈمی کے ڈائریکٹر اور نہایت ثقہ شخصیت تھے وہ میری ایک شکایت پر نہایت محظوظ ہوئے اور بعد میں انفارمیشن میں میری تقرری کے دوران ان سے بہت ہی قریبی مراسم رہے بلکہ میں اور احمد فراز اکثر شامیں انھیں کے ساتھ گذارتے۔ بہرحال میری شکایت یہ تھی کہ ہر روز جب میں ہوسٹل کی عمارت سے اکیڈمی آتا تو راستے میں پانی کا ایک نل خراب ہونے کے باعث مستقل بہتا رہتا اور میرے بار بار توجہ دلانے کے باوجود اکیڈمی کے ایڈمن آفیسر نے کوئی توجہ نہیں دی تھی چنانچہ راجہ صاحب سے میں نے کہا کہ مجھے اس نل کے بہنے سے سخت تکلیف پہنچتی ہے اگر کل تک اسے بند نہ کرایا گیا تو میں احتجاجاً اکیڈمی چھوڑ جاؤں گا۔ سچ یہ ہے کہ مجھے آج بھی پانی کے ضیاع پر سخت کوفت ہوتی ہے بلکہ پشاور ہی میں ایک روز دفتر کے بعد ڈرائیور مجھے گھر لے جا رہا تھا سخت بارش ہو رہی تھی راستے میں ایک نل بہتا دیکھا اور خود گاڑی سے اتر کر نل بند کرنا چاہا لیکن ہنستے ہوئے یہ کام ڈرائیور نے خود انجام دے دیا۔ ایک اور دلچسپ واقعہ اکیڈمی ہی کے دوران قیام پیش آیا۔ زیر تربیت افسران دوپہر اور شام کا کھانا اکیڈمی کے ڈائننگ ہال میں کھاتے تھے ان دنوں مجھے شطرنج کھیلنے کا بڑا شوق تھا بلکہ یہ شوق لائلپور میں پروان چڑھا۔ جہاں ہمارے ایک دوست عبدالرحیم صاحب جنھیں میں پیار میں لنگڑیال کہتا تھا اور ان کے بڑے بھائی جناب بدرالدین صدیقی ایڈوکیٹ میرے ساتھ شطرنج کھیلنے تقریباً روز ہی آتے تھے چنانچہ پشاور اکیڈمی کے ڈائننگ ہال میں دوپہر کے کھانے پر ایک غیر ملکی نوجوان سیاح سے میری ملاقات ہو گئی باتوں باتوں میں میں پوچھ بیٹھا کہ کیا آپ کو شطرنج کا بھی شوق ہے چنانچہ جواب میں اس شخص نے پتلون کی اپنی ایک جیب سے پلاسٹک کی بساط نکالی اور دوسری سے مہرے اور بساط جما کر کہا کہ چلو چال میں حیران ضرور ہوا لیکن خوش بھی اور پورے

تکبر کے ساتھ چال چل دی ابھی چار چھ چالیں ہی چلی تھیں کہ نہ جانے کیسے مجھے اچانک مات ہو گئی اور اس طرح میرا شطرنج دانی کا غرور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاک میں مل گیا۔

داؤ پر ہم تو لگا بیٹھے جوانی اپنی
آپکی چال ہے اب اے شہ خوباں چلیے

نہ جانے یہ شعر کیوں اچانک یاد آگیا بہر حال اس کا تعلق بھی پشاور ہی سے ہے۔ ۱۹۶۴ء میں پشاور میں ڈائریکٹر انفارمیشن کی حیثیت سے میری تعیناتی کے دوران مجھے بے شمار شعری اور ادبی محفلوں میں شرکت کا موقع ملا انہیں دنوں ریڈیو پاکستان پشاور کے زیر اہتمام ایک خوبصورت محفل مشاعرہ منعقد کی گئی جس کی صدارت جناب زیڈ۔ اے بخاری نے فرمائی۔ اور مندرجہ بالا شعر انہیں کی گرجدار آواز میں سنا جو آج تک حافظے میں محفوظ ہے لیکن احمد فراز کی ایک غزل نے تو تقریباً میری جان ہی لے لی تھی انہیں دنوں فراز نے اپنی وہ مشہور غزل کہی تھی جس کا مطلع ہے۔

اب جو بچھڑیں گے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

میں اور فراز شام کی نشست کے بعد راجہ محمد افضل خاں صاحب کی رہائش گاہ یونیورسٹی ٹاؤن سے واپس آ رہے تھے ان دنوں میرے پاس ایک سپورٹ ماڈل بی ایم ڈبلیو کار تھی جسے میں خود چلا رہا تھا اور فراز اپنی غزل سنا رہے تھے کہ اچانک پتھروں سے لدے ہوئے ایک ٹرک سے جو عین ہمارے سامنے رواں تھا ایک بڑا سا پتھر گرا اور ہماری گاڑی کے نیچے آگیا سپورٹ ماڈل ہونے کے باعث چونکہ گاڑی نیچی بہت تھی ایسا لگا جیسے زمین و آسمان ہل گئے ہوں گاڑی کا سٹیرنگ باہر نکل کر میری گردن کو اپنے اور سیٹ کی پشت کے درمیان میری آنکھیں باہر نکال دینے کی حد تک دبا چکا تھا

زیڈ اے بخاری (مرحوم) کی زیرصدارت منعقدہ ریڈیو پاکستان پشاور کے سالانہ مشاعرے میں (۱۹۶۴ء) (دائیں سے) فارغ بخاری۔ قتیل شفائی۔ رضاہمدانی۔ منصور عاقل (غزل پڑھتے ہوئے) اور صدر مشاعرہ زیڈ اے بخاری

فراز پر کیا بیتی اس کا مجھے علم نہ تھا البتہ دیکھا کہ فراز کے ساتھ مل کر ایک اور شخص میری "گلو خلاصی" کی کوشش میں مصروف تھا۔ بہر حال فراز کی اس غزل کو کوئی بھولے نہ بھولے لیکن میں ہر گز نہیں بھول سکتا کیونکہ عین ممکن تھا کہ ہم دونوں ہی زندگی کی کتاب کے آخری ورق میں سوکھے ہوئے پھولوں کی طرح مدفون ہو جاتے۔

احمد فراز کی دلچسپی کا محور و مرکز ان دنوں صرف پشاور ہی تھا میرے مشورہ سے انھوں نے ایک ادبی انجمن کی بنیاد رکھی اور نام تجویز کیا"حلقہ سخن" سرپرستی کے لیے جناب مسرور حسن خاں پر نظر پڑی اس لیے نہیں کہ وہ کمشنر تھے اور ایسے صاحبان اقتدار کو علمی و ادبی سرگرمیوں کے اعزازات سپرد کر دینا ہمارے معاشرہ کی روایت بن چکا تھا بلکہ مسرور حسن خان صاحب واقعی ایک صاحب علم اور اعلی ادبی و شعری ذوق کی مالک شخصیت تھے اور بیک وقت ایک نہایت زیرک' دانا اور با صلاحیت سول سرونٹ بھی چنانچہ پشاور میوزیم کے ہال میں حلقہ سخن کا پہلا اجلاس مسرور حسن خاں صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا فراز کی جانب سے تجویز کیا گیا کہ حلقہ کی رکنیت کو صرف مخصوص لوگوں تک محدود رکھا جائے لیکن مجھے اس بات سے اتفاق نہ تھا اور وہ اس لیے کہ میں چاہتا تھا کہ پشاور میں جتنے بھی اہل قلم ہیں وہ سب ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو جائیں احمد فراز اور محسن احسان کے درمیان ان دنوں کھنچاؤ بلکہ باہمی رنجش کی ایک فضا قائم تھی حالانکہ شعرو ادب کی خدمت کا کام دونوں ہی نے مقدور بھر انجام دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ پشاور کے اہل قلم جن میں رضا ہمدانی' فارغ بخاری' خاطر غزنوی اور روشن نگینوی وغیرہ بھی شامل ہیں صرف اس دور ہی میں نہیں اس سے پہلے اور بعد میں بھی اپنی قلمی کاوشوں کے باعث ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے ایک اور ہستی جس کا ذکر میں خاص طور پر کرنا چاہوں گا وہ مرزا محمود سرحدی تھے لوگ انھیں اکبر سرحد کہتے تھے اور بجا کہتے تھے مرزا مرحوم کامزاج منفرد اور وہ اس لیے کہ وہ حرف و صوت ہی کی صورت گری پر قادر نہیں تھے بلکہ شعر کے تہہ در تہہ معانی و مفہوم میں ان کی درد مند سوچ اور لطیف طنز کار فرما ہوتی تھی وہ پھکڑ بازی کو مزاحیہ شاعری کا نام دینے کو ہر گز تیار نہ تھے ایک طویل مدت تک دمہ کے موزی مرض میں مبتلا رہنے کے بعد خود تو عدم کو سدہار گئے لیکن اپنے لازوال کلام کا ورثہ

قوم کے سپرد کر گئے مجھ سے خصوصی شفقت فرماتے تھے اور اکثر میرے پاس دفتر تشریف لاتے اور پشاوری قہوہ پیتے جاتے اور میری فرمائش پر یا ازخود شعر سناتے جاتے۔ مرحوم صدر ایوب خاں کے دور میں پہلی بار ڈپٹی کمشنر صاحبان کی صدارت میں رویت ہلال کمیٹیاں قائم کی گئی تھیں تاکہ دو دو عیدیں نہ ہوں مگر صوبہ سرحد کی روایت کے عین مطابق مرزا اس معاملہ میں سرکاری مداخلت کے قائل نہ تھے چنانچہ ملاحظہ کیجئے مرزا محمود سرحدی کا طنز سے بھرپور قطع جسے میں صرف ان کے نمائندہ کلام کے طور پر پیش کر رہا ہوں

ہماری عید ہے ہم ہر طرح منائیں گے
ہمیں تو شیخ کے فتوے پر اعتبار نہیں
ہمارے ڈپٹی کمشنر نے چاند دیکھا ہے
ہمیں خبر ہے کہ وہ غیر ذمہ دار نہیں

پشاور میں فارسی گو شعراء کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی لیکن مجھے جن سے شرف ملاقات بھی رہا اور جن کے فارسی کلام سے میں متاثر بھی ہوا ان میں جناب کوکب، جگر سرحدی اور آقائے ابو لکیف کیفی تھے۔ امیر حمزہ شنواری اگرچہ بنیادی طور پر پشتو شاعر تھے لیکن فارسی میں بھی ان کی مہارت کم نہ تھی کبھی کبھی میرے دفتر تشریف لاتے اور اپنی وضعداری اور احترام روایت کا نقش میرے دل و دماغ پر مرتسم کر جاتے۔ حقیقت میں یہ وصف میں نے سارے پختون معاشرہ میں دیکھا وضعداری اور مہمان نوازی پٹھانوں کے اعلی ترین اوصاف ہیں۔

پشاور میں میرا قیام ایک سال سے بھی کم رہا لیکن یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ آج تک قائم ہے مجھ سے دفتر کے لوگ بھی بہت محبت کرتے تھے ایک مرتبہ ایک اہلکار راحت ملک کی جواب طلبی محض اس لیے ہو گئی کہ ایک وزیر صاحب جو لاہور سے پشاور آئے ہوئے تھے۔ ان کو اخبارات نہ بھجوائے جا سکے۔ جس کے باعث وہ سخت ناراض ہو گئے یہ کام راحت کے فرائض میں شامل تھا۔ لیکن پتہ یہ چلا کہ

پشاور میں آقائے ابوا لکیف کیفی کے دولت کدے پر الوداعی تقریب سے خطاب۔
(۱۹۶۴)

لوگ ایک دوسرے سے تو کہتے رہے لیکن بات راحت ملک تک نہ پہنچ سکی چنانچہ اس نے جواب طلبی پر اپنی درخواست میں منجملہ دوسری باتوں کے فارسی کا یہ شعر بھی لکھا۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت گل چہ شنید و صبا چہ کرد

میں یہ خوبصورت شعر پڑھ کر تڑپ اٹھا۔ راحت ملک کو بلوایا تو پتہ چلا کہ وہ جناب ایس۔ ایم۔ جعفر کا بھانجہ ہے۔ جعفر صاحب سے مجھے غائبانہ خصوصی عقیدت تھی ان کی بعض کتب کا مطالعہ میں نے ایم۔ اے تاریخ کی تیاری کے دوران کیا تھا جعفر صاحب ایک بلند پایہ محقق اور مورخ تھے اور ان دنوں پشاور میوزم کے کیوریٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے چنانچہ جتنا عرصہ مزید میں پشاور میں رہا جعفر صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں بلکہ تاریخ کے شعبہ میں ان کی تحقیقی رہنمائی سے میں نے استفادہ بھی کیا۔

یہ ۱۹۶۴ء کا پشاور تھا جس میں ادبی ہنگاموں کے ساتھ ساتھ سیاسی گہما گہمی بھی عروج پر تھی صدارتی انتخابات ہونے والے تھے محترمہ فاطمہ جناح نے اپنے صدارتی الیکشن کی مہم کا آغاز پشاور میں ایک عظیم الشان جلسہ کر کے کیا تھا اس جلسے کی بڑی دہاک بیٹھی تھی نہ جانے مرحوم ایوب خان کو کس نے مشورہ دیا کہ وہ بھی اپنی مہم کا آغاز پشاور ہی سے کریں چنانچہ جلسہ کی سرکاری تیاریاں شروع ہو گئیں۔ کئی دن پہلے سے مرکزی وزراء حکام اور جغادری سیاستدان پشاور پہنچ گئے وزیر داخلہ حبیب اللہ خان نے تو میرے دفتر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا میرا تمام عملہ دن رات مصروف رہنے لگا آخر زبردست انتظامات کے بعد جلسہ کا دن آپہنچا مگر سرکاری مشینری کی سر توڑ کوششوں کے باوجود جلسہ کامیاب نہ ہو سکا۔ صدر صاحب کی تقریر کے دوران سخت افراتفری مچی رہی لوگ اٹھ کر جلسہ گاہ سے باہر جانے لگے اور انھیں روکنے کے لیے پولیس والوں کی کوششیں بھی کارگر نہ ہو سکیں اخباری نمائندوں کی

پوری فوج وہاں موجود تھی۔ وزارت اطلاعات کے انتظامات بھی بھرپور تھے مگر حالات کا بگڑا ہوا رخ دیکھ کر میرے فوٹو گرافر نے جس ذہنی اپج سے کام لیا وہ بات کسی کو بھی نہ سوجھی اس نے سٹیج کے قریب سے صدر صاحب کا ایک فوٹو بنانے کے بعد جلسہ کی تصویر قلعہ بالا حصار سے جا کر بنائی جس کا فائدہ یہ ہوا کہ تمام افراتفری کے باوجود سر ہی سر تصویر میں نمایاں تھے اور ایسا لگتا تھا کہ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر صدر کی تقریر سن رہا ہے اسی روز یہ تصویر اخبارات کو جاری کر دی گئی اور خصوصی جہاز سے کراچی بھی بھجوا دی گئی۔ تصویر کا بھرپور تاثر ہونے کے باعث اکثر اخبارات نے اشاعت کے لیے اس کو منتخب کیا بلکہ ڈان کے صفحہ اول پر یہی تصویر چھپی لیکن جلسہ کے فوراً" بعد گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں صدر مملکت کی برہمی کا جو عالم میں نے دیکھا اس نے مجھے انتہائی خوفزدہ کر دیا کیونکہ جہاں مغربی پاکستان مسلم لیگ کے صدر مرحوم راجہ حسن اختر اور وزیر داخلہ حبیب اللہ خاں جیسے لوگ لتاڑے جا رہے ہوں وہاں بیچارے سرکاری ملازمین کی کیا حیثیت مگر اگلی صبح اخبارات میں اسی تصویر نے لاج رکھ لی اور ہم نے محسوس کیا کہ روانگی کے وقت صدر محترم کا موڈ اچھا تھا۔ البتہ عجیب اتفاق یہ ہوا کہ راجہ حسن اختر صاحب جو گذشتہ شام ہی پشاور سے روانہ ہو چکے تھے ان کی اچانک وفات کی خبر اگلے روز ہی کے اخباروں میں چھپی۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون"

جنوری ۱۹۶۵ء میں میرا تبادلہ راولپنڈی ہو گیا اس موقع پر اہل پشاور نے جس محبت سے مجھے رخصت کیا میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا ان گنت الوداعی تقریبات منعقد ہوئیں اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ روزوں کے دن ہونے کے باعث کیونکہ صرف افطاریوں ہی کا اہتمام کیا جا سکتا تھا لہذا بعض حضرات کے اصرار پر مجھے تقریباً" ایک ہفتہ تک دوستوں کے ساتھ سحریاں بھی کھانے کا اعزاز حاصل ہوا اور وہ بھی اس طرح کہ میرے اور میرے اہل خانہ کو ان دنوں کی شدید سردی میں تکلیف نہ دینے کے خیال سے احباب سحری کے جملہ سامان خور ونوش کے ساتھ میرے گھر پہنچ جاتے تھے مجھے آج تک احساس ہے کہ ایسا خلوص اور محبت کا ماحول مل جانا یقیناً" میری خوش قسمتی تھی۔

پشاور میں ایک مخصوص ادبی نشست سے خطاب (۱۹۶۴) (دائیں سے) اقبال محمود۔
باسط سلیم۔ منصور عاقل (تقریر کرتے ہوئے) مسعود انور شفقی۔ مولانا اسمٰعیل ذبیح۔
شہزاد احمد۔ صادق نسیم۔ ناصر کاظمی اور پس منظر میں علامہ سید قابل گلاؤٹھوی

جاں گسل حادثہ

مجھے راولپنڈی آئے ابھی ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا کہ میں اپنی زندگی کے انتہائی جاں گسل حادثہ سے دوچار ہوا میری والدہ دو تین دن کی معمولی علالت کے بعد ۲۸ فروری ۱۹۶۵ء کو رحلت فرما گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

جب والد صاحب کا انتقال ہوا تھا تو میری کم عمری کا دور تھا پھر والدہ کا سہارا اور سرپرستی چنانچہ باپ کی جدائی کے زخم مندمل ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن اب تو سر سے ماں کا سایہ اچانک اٹھ جانے کے باعث بے سہارا رہ جانے کا احساس انتہائی شدید ہو گیا تھا اور آج تک نہ جانے کیوں یہ احساس محرومی دامن گیر ہے۔ حالانکہ اس وقت بھی اور آج بھی میں خود کفیل تھا اور ہوں لیکن میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں اس احساس محرومی کو بیان کر سکوں جو ماں کی موت کے بعد میری زندگی میں ایک مستقل چبھن بن کر رہ گیا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہی قانون قدرت ہے کہ کوئی رہا ہے نہ رہے گا لیکن جس ماں کے لیے میرا دل آج تک روتا ہے میں اس کی محبت کا ادنیٰ سے ادنیٰ قرض بھی تو نہ اتار سکا ان کی خدمت کی آرزو دل کے دل ہی میں رہ گئی۔ غالباً ان کی عظمت کا یہ بھی ایک پہلو تھا کہ وہ صرف قربانی دینا جانتی تھیں معاوضہ وصول کرنا نہیں۔ میری شادی کی آرزو ان کی زندگی کے آخری دنوں کا واحد نصب العین بن کر رہ گئی تھی اور یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ اس معاملہ میں ان کا فیصلہ ہی میرے لیے سعادت کا باعث ہے وہ اس فرض سے جلد از جلد سبکدوش ہو جانا چاہتی تھیں اور تقریباً تمام معاملات اپنے سدھیانے سے پشاور ہی کے قیام کے دوران بذریعہ مراسلت طے کر لیے تھے بلکہ میرے لیے انہوں نے کچھ سہرے کے اشعار بھی

کہے تھے جس کا ایک شعر میرے حافظے میں مستقل تڑپ بن کر آج تک محفوظ ہے ذرا جذبہ و احساس کی شدت تو دیکھیے۔ کہتی ہیں

صبا جنت سے لیکر آ مرے منصور کا سہرا
مرے سرکارؐ کی خوشبو سے ہو مہکا ہوا سہرا

کسے خبر تھی کہ سہرے کے یہ پھول جنت سے وہ خود بھجوائیں گی اور ۲۲ نومبر ۱۹۶۵ء میرے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے لیے ان کی آرزو کی تکمیل کا دن ٹھہریگا میری بیوی میری ماں کا انتخاب ہیں اور میری زندگی کا سب سے قیمتی تحفہ۔

۱۹۶۵ء کا سال سخت ہنگامہ خیز سال تھا میری زندگی ہی میں نہیں بلکہ ساری پاکستانی قوم کی زندگی میں کیونکہ بھارت نے انتہائی بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستان پر اچانک حملہ کر دیا تھا کشمیریوں کی تحریک مزاحمت کے نتیجہ میں اسے مقبوضہ کشمیر ہاتھ سے جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ سترہ دن کی پاک بھارت جنگ نے پاکستانیوں میں قومی تشخص کا احساس جس طرح بیدار کیا وہ ہماری تاریخ کا سنہرا باب بن چکا ہے قوم نے اپنے اتحاد و یک جہتی سے ثابت کر دیا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی چٹان ہے جس سے سر ٹکرا کر دشمن کو لہولہان ہونے کے سوا کچھ نہیں ملے گا مجھے یاد ہے کہ ایسا جذبہ میں نے یا تو تحریک پاکستان کے دوران دیکھا تھا یا ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران جب ہماری افواج ہی نہیں بلکہ آزادی کے تحفظ میں ملک کا بچہ بچہ شریک تھا بلکہ اہل قلم نے جس قلمی جہاد کا مظاہرہ کیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے سترہ دن کی جنگ کے دوران ملک کی تاریخ کا بہترین لٹریچر تخلیق کیا گیا اور اس قدر کہ پاکستان کا کوچہ کوچہ شاعروں اور مغنیوں کے حب وطن سے معمور گیتوں اور نغموں کی گونج سے سرشار و سرمست ہو گیا آج بھی وہ نغمے جب کانوں میں رس گھولتے ہیں تو دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں اور خون کی تیز تر گردش کا گرم گرم احساس قومی جذبہ و حمیت کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

سید اشتیاق اظہر کے اعزاز میں مصنف کی رہائش گاہ پر راولپنڈی میں ایک شعری
نشست۔ (دائیں سے) عبدالعزیز فطرت سید اشتیاق اظہر۔ منصور عاقل (میزبان) ایوب
محسن۔ باقی صدیقی تجمل حسین اختر اور الطاف پرواز (۱۹۶۵)

پاکستان نیشنل سنٹر راولپنڈی میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی زیر صدارت منعقدہ
تقریب اقبال سے خطاب (۱۹۶۵)

ہم یہ جنگ نہیں ہاریں گے۔

راولپنڈی میں اہل قلم کی سرگرمیوں کا مرکز پاکستان نیشنل سنٹر بن گیا تھا لکھنے والوں کے ایک اجتماع سے خطاب کے دوران مجھے جناب الطاف گوہر کے یہ الفاظ نہیں بھولتے جو انھوں نے آنکھوں میں یقین کی چمک اور پورے اعتماد کے ساتھ کہے کہ "ہم یہ جنگ ہرگز نہیں ہاریں گے اور اگر یہ جنگ ہاری گئی تو ہارنے والے کوئی اور ہونگے ہم نہیں ہونگے" اللہ اللہ ایمان ویقین کا یہ عالم اور وطن کے تحفظ کی خاطر جان قربان کر دینے کا یہ جذبہ اس کی مثالیں صرف اسلامی تاریخ ہی سے مل سکتی ہیں کیونکہ یہ سرفروشانہ جذبات ہمیشہ مسلمانوں ہی کی میراث رہے ہیں جس کا بہترین ثبوت آج کا مسلم بوسنیا ہے جہاں مسلمانوں نے ثابت کر دیا ہے کہ آزادی کے بغیر ان کے یہاں زندگی کا کوئی تصور نہیں اختر شیرانی نے کہا تھا۔

عشق و آزادی بہار زیست کا سامان ہے
عشق میری جان آزادی مرا ایمان ہے
عشق پہ کردوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

پاکستان نیشنل سنٹر میں مقامی اہل قلم ہی کے اجتماع میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جو میرے علاوہ جناب آغا بابر اور حکیم یوسف حسن (مرحوم) مدیر نیرنگ خیال پر مشتمل تھی اور کام یہ سپرد کیا گیا تھا کہ جنگ ستمبر کے سلسلہ میں تخلیق کی جانے والی قومی شاعری کا بہترین انتخاب مرتب کیا جائے تاکہ اسے شائع کرایا جا سکے۔ چنانچہ یہ سعادت مجھے نصیب ہوئی کہ دفتر اطلاعات کے زیر اہتمام میں نے مقامی شعراء کا انتخاب کلام "خامہ خونچکاں اپنا" کے نام سے ترتیب دے کر شائع کیا جس کا ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں بے حد خیر مقدم کیا گیا اور اس طرح راولپنڈی ڈویژن کے اہل قلم کے جہاد کی تاریخ محفوظ کر دی گئی۔ ابو الاثر حفیظ جالندہری نے جن کا کلام بھی اس انتخاب میں

شریک تھا ایک ایسا واقعہ سنایا جس سے ان دنوں لوگوں کے دلوں میں ایقان وایمان کی جو شمع روشن تھی اور جذبہ جہاد کا جو ولولہ کار فرما تھا اس کی بہترین عکاسی ہوتی ہے حفیظ صاحب نے خود مجھے بتایا کہ انہیں جنگ کے فوراً بعد سیالکوٹ کے محاذ پر لیجایا گیا تاکہ وہ اور دیگر اہل قلم و صحافی اپنی آنکھوں سے خاک و خون کی آندھی رک جانے کے بعد کی کیفیات کا اندازہ لگا سکیں اس قافلہ کی رہنمائی چند فوجی جوان کر رہے تھے واپسی پر سب کے دل شکر خداوندی کے جذبے سے لبریز تھے اور سب کی ایک ہی رائے تھی کہ اتنے خوفناک اور طاقتور دشمن کے مقابلے میں سرخروئی اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر ناممکن تھی لیکن ایک سپاہی جو یہ گفتگو سن رہا تھا پورے جوش مگر معصومیت کے انداز میں بولا جناب اللہ نے ہماری کوئی مدد نہیں کی اس پر سب چونکے اور سنجیدہ ہو گئے کہ یہ شخص کیا کفر بک رہا ہے لیکن اس نے اپنا جملہ اس طرح مکمل کیا کہ یہ جنگ ہی اللہ نے لڑی ہے ورنہ یہ کام ہمارے بس کا نہیں تھا۔ مگر بین الاقوامی سیاست کیا بلکہ سازش کے ہاتھوں وہ دن بھی آگیا کہ پاکستان کو تاشقند کانفرنس میں شرکت کرنا پڑی تاریخ کے پس پردہ اگر دیکھا جائے تو ایسی مثالیں کثرت سے ملیں گی کہ مغربی سازشی اذہان نے جب میدان میں جنگ ہارتے دیکھی ہے تو اسے میز پر منتقل کر کے اپنی عیاری سے جیت لیا ہے۔ چنانچہ یہی کچھ تاشقند میں ہوا مجھے یاد ہے کہ میں تاشقند کے وفد کی روانگی کے موقع پر صحافیوں کی ایک جماعت لیکر چک لالہ کے ہوائی اڈے گیا تھا اور اس وفد کو امید و بیم کے ایک عجیب عالم میں رخصت کیا گیا تھا۔ تمام قوم کی نگاہیں وفد اور تاشقند مذاکرات پر جمی ہوئیں تھیں بڑی ہی تناؤ کی فضا تھی قوم کا مورال بہت بلند تھا بلکہ اچانک سیز فائر اکثر ذہنوں پر گراں گذرا تھا لیکن چونکہ ملکی قیادت پر عوام کا بھرپور اعتماد تھا اس لیے اب قوم کا بچہ بچہ تاشقند سے برآمد ہونے والے نتیجے پر ٹکٹکی باندھے بیٹھا تھا میں جب ائرپورٹ سے واپس آیا تو سیدھا راولپنڈی ریڈیو سٹیشن گیا کیونکہ ان دنوں پنڈی یا آزاد کشمیر ریڈیو سے تقریباً ہر روز ہی مجھے ایک نہ ایک نشریئے کے لیے جانا پڑتا تھا آج میری جو نظم براڈ کاسٹ ہوئی اس کے چند شعر یہ تھے۔
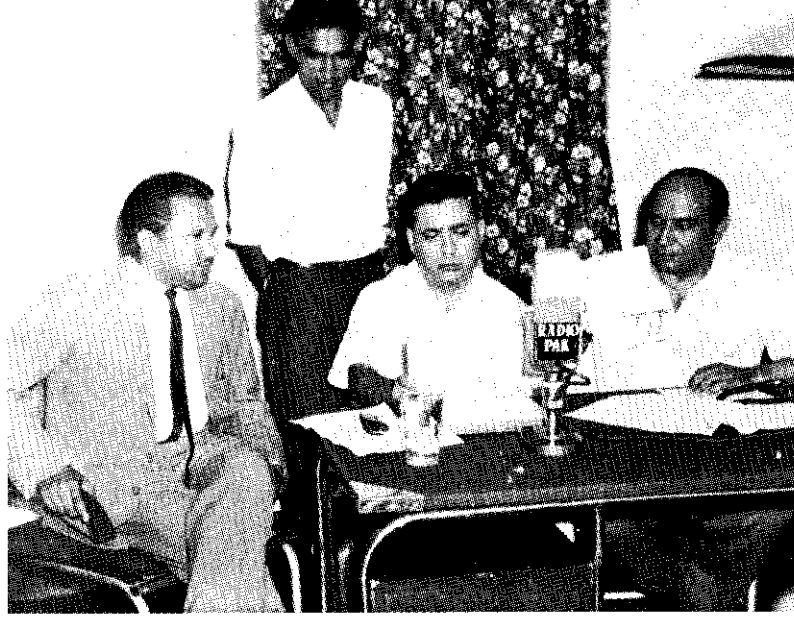
ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے نشر ہونے والے ایک قومی مذاکرے میں (۱۹۶۵ء)

گئے تو ہو ظلمتوں کی زد پر یقین کی شمعیں جلا کے آنا
وطن کی عظمت کے پاسبانو وطن کی عظمت بڑھا کے آنا

دعائیں اہل وطن کی لیکر بہ عزم بیدار جانے والو
تمہیں قسم ہے عقیدتوں کی وطن کا سکہ جما کے آنا

صداقتوں کے امین ہو تم شجاعتوں کو ہے ناز تم پر
تم اپنے آداب صدق کیشی سے ظلم کا سر جھکا کے آنا

تمہارا مکر و ریا کے سوداگروں سے پھر سابقہ ہے دیکھو
عدو کی تازہ فریب سامانیوں سے دامن بچا کے آنا

تمہارے جاں باز برسر رزم گاہ بھی سرخرو رہے ہیں
تم اس نئی بزم میں بھی فتح و ظفر کے پرچم اڑا کے آنا

کہیں مورخ تمہاری قومی مروتوں کو غلط نہ سمجھے
حقیقتوں کو جتا کے اٹھنا ضمیر عالم جگا کے آنا

تمہارے کردار منصبی پر ہیں اہل کشمیر کی نگاہیں
بس اب یہی کام ہے تمہارا کہ کام اہل وفا کے آنا

قوم کا ایک ایک فرد سخت بے چینی کے عالم میں وفد کی واپسی پر کانفرنس کے نتائج سننے کے لیے ایک عجیب نفسیاتی کیفیت سے دوچار تھا تاہم یہ خبر تو آ ہی چکی تھی کہ بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری اچانک دل کا دورہ پڑنے سے موت کی آغوش میں چلے گئے ہیں چنانچہ تاشقند سے ہمارا وفد واپس آیا اور بالکل اسی طرح

اخباری نمائندے ائرپورٹ پہنچے جس طرح روانگی کے وقت گئے تھے اور میری آنکھوں نے بھی یہ منظر دیکھا کہ وفد کے وہ ارکان جو اس جہاز سے آئے تھے ایک ایک کر کے گاڑیوں میں بیٹھے اور اخبار والوں کو تکتا دیکھتے آنا" فانا" میں ائرپورٹ سے رخصت ہو گئے کسی فرد کے منہ سے قوم کو پیغام کے نام پر اک لفظ تک ادا نہ کیا گیا جبکہ پورے ملک میں انتظار کی نفسیاتی فضا اپنے نقطہ عروج کو پہنچی ہوئی تھی بچے بچے کے کان الیکٹرانک میڈیا پر لگے ہوئے تھے چنانچہ جواب میں جب سناٹے کی یہ فضا قائم ہوئی تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام ملک میں قسم قسم کی افواہیں پھیلنا شروع ہو گئیں قوم کا پیمانہ صبرلبریز ہو چکا تھا چنانچہ بے چینی اور عدم اعتماد کی فضا نے پورے ملک کو تیزی سے اپنی لپیٹ میں لے لیا وزیروں کو اپنے اپنے علاقوں میں روانہ کیا گیا تاکہ لوگوں کو سمجھایا جائے مگر اس کام کے لیے بہت دیر ہو چکی تھی لاوا پھٹ پڑا تھا اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی حکومت ڈولتی دکھائی دے رہی تھی۔ نیشنل اسمبلی کا اجلاس بھی ہوا ان دنوں نیشنل اسمبلی کے اجلاس لال کرتی کی اس عمارت میں ہوتے تھے جہاں آج کل نیشنل ڈیفنس کالج واقع ہے میں نے خود وزیر خارجہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کو تاشقند معاہدے کے دفاع میں نہایت پر جوش اور فصیح و بلیغ انگریزی میں تقریر کرتے سنا جسے اگلے روز کے اخباروں نے نمایاں طور پر شائع بھی کیا لیکن عوام کو وزیر خارجہ کی بے مثال خطابت بھی مطمئن نہ کر سکی اور "نیرنگی سیاست دوراں تو دیکھئے" کہ پھر وزیر خارجہ حکومت سے سبکدوش ہو کر عوام کی صفوں میں آئے تو قوم پوری والہانہ عقیدت کے ساتھ ان کی زبان سے تاشقند کا راز سننے کے لیے گوش بر آواز ہو گئی۔

تاشقند معاہدے کے حوالے سے حکومت کی ناکامی کے بہت سے اسباب بیان کئے گئے ملکی اور غیر ملکی پریس میں یہ معاہدہ ایک مدت تک موضوع بحث بنا رہا۔ تاویلات اور اسباب و علل پر آراء کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا لیکن مجھ ایسے شخص کی نظر میں جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہ ہو اور جو حالات و واقعات کا تجزیہ صرف تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یا اپنے فرائض منصبی کے حوالے سے ایک صحافی کی حیثیت سے کرتا ہو صرف ایک ہی سبب سب سے واضح تھا۔ جس پر تفصیلی

ریڈیو پاکستان راولپنڈی کی ایک خصوصی ادبی تقریب میں (۱۹۶۵ء) (بائیں سے) محترمہ
ممتاز جمال وزیر مغربی پاکستان - اشرف ہاشمی

گفتگو کا موقع مجھے اس وقت بھی ملا جب اس ملک کے ایک نہایت بالغ نظر صحافی جناب مجیب الرحمن شامی شعیب بن عزیز کے ہمراہ ۱۹۸۰ء میں لاہور میں میرے گارڈن ٹاؤن والے گھر آئے تو میں نے انھیں اپنی رائے بتائی جس سے انھوں نے بھرپور اتفاق کیا کہ تاشقند کے موضوع پر حکومت کے پاؤں اکھڑ جانے کا سب سے بڑا سبب "پبلسٹی فلاپ" تھا۔ اور اس کی ذمہ داری ان تمام ارباب بست و کشاد پر عائد ہوتی ہے جو ان دنوں میڈیا کے بارے میں فیصلے کرنے کے لیے مختار کل بنے ہوئے تھے تعجب ہے کہ ان حضرات کی سمجھ میں اتنی سی بات نہ آسکی کہ ایک ایسے اعصاب شکن نازک مرحلے پر جب ساری قوم تاشقند کا فیصلہ سننے کے لیے سانس روکے منتظر بیٹھی ہو تو یہ ہرگز مناسب نہ تھا کہ تاشقند سے واپسی پر ایک لفظ بھی نہ کہا جائے حد یہ ہے کہ اس خاموشی کا سبب فوری طور پر شاستری کی موت کو بھی نہیں قرار دیا گیا حقیقت میں چاہیے تو یہ تھا کہ سرکاری طور پر ایک بیان واپسی پر جاری کر دیا جاتا اور شاستری کے "کریا کرم" کی رسوم کے بعد پوری طرح قوم کو اعتماد میں لیا جاتا تو ہرگز حکومت عوامی ہیجان کے زلزلے کی زد میں نہ آتی اور یہ عین ممکن تھا کہ ایوب حکومت حالات پر قابو پالیتی کیونکہ آج تک تاشقند معاہدے کے نتیجہ میں کوئی ایسی بات منظر عام پر نہیں آئی ہے جو کسی بھی حکومت شکن عوامی ردعمل کا باعث ہو سکتی۔

سقوط مشرقی پاکستان۔

راولپنڈی میں دوسری بار میری تقرری انفارمیشن ہی میں ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۳ء تک رہی یہ دور بھی نہایت ہنگامہ خیز تھا اس بار پاک بھارت جنگ کا میدان مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان دونوں محاذوں پر گرم ہوا اور ۱۹۷۱ء ہی میں سقوط مشرقی پاکستان کا سانحہ رونما ہوا جس نے تمام قوم کو زندگی کی بدترین اذیت سے دوچار کر دیا۔ مجھے صرف ایک ہی سال قبل ۱۹۷۰ء میں ایک ماہ کے ایک مطالعاتی دورہ پر مشرقی پاکستان جانے کا موقع ملا تھا اور میں نے صوبے کے تقریباً" تمام ہی قابل ذکر مقامات اور اداروں کا دورہ کیا تھا اور واپسی پر حکومت کو ایک مفصل رپورٹ پیش کی تھی میرے

اس دورے کا اہتمام مرکزی حکومت کی انفارمیشن سروسز اکیڈمی کی جانب سے کیا گیا تھا جس کے سربراہ اور ڈائریکٹر ایک جید صحافی اور زیرک افسر جناب اسلم صدیقی تھے۔ وہیں مجھے چند نئی دوستیوں کا خوشگوار تجربہ بھی ہوا جو آج تک میرا سرمایہ حیات ہے چار ماہ کے ایک تربیتی کورس کے لیے حکومت نے مجھے اکیڈمی میں نامزد کیا تھا اس مدت میں میرا قیام گورنمنٹ ہاسٹل میں رہا جہاں میرے کمرے کے بالکل مقابل فرحت اللہ بابر صاحب کا کمرہ تھا فرحت صاحب منسٹری آف انفارمیشن کے پروبیشنر کی حیثیت سے اکیڈمی میں زیر تربیت تھے ہوسٹل میں قرابت کے باعث فرحت صاحب کے عظیم اوصاف جاننے کا موقع ملا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ مخلص' متواضع اور شفاف دل کے مالک پٹھان معاشرہ کے بہترین نمائندہ ہیں اور اعلی ظرفی میں بھی اپنی مثال آپ ہیں دوسروں کے دکھ درد میں بھرپور انداز میں شریک ہو جانے کا جو جذبہ وحوصلہ میں نے فرحت صاحب میں دیکھا وہ میری زندگی کا ذاتی تجربہ بھی ہے اور ان کی صداقت پسندی کی روشن مثال بھی کوئی ایک دن بھی ایسا نہ ہوتا کہ فرحت صاحب اپنے کمرے مین تنہا ہوتے ہوں بلکہ بیڈ تو ایک طرف کر دیا گیا تھا اور سارے کمرے میں مہمانوں کے لئے بستر لگا دیئے گئے تھے وہ ہر مختصر و طویل قیام کرنے والے کسی بھی مہمان کو یہ محسوس نہ ہونے دیتے کہ یہ مسلسل میزبانی کسی طرح بھی ان کے لئے باعث تکلیف ہے۔ ان کی زندگی میں سادگی اور خلوص کی جو مضبوط بنیاد تھی آج بھی قائم ہے جب کہ اللہ نے انہیں ہر طرح سے مرتبہ و شہرت سے بھرپور نوازا ہے ایک بار میں ان کے دفتر گیا جب وہ اٹامک انرجی کمیشن میں ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز تھے دیکھا کہ ان کے چھوٹے سے کمرے میں گورنر سندھ رحمان گل بیٹھے ان کے ساتھ باتوں میں مصروف ہیں اور مٹھو جیسی پشاوری پیالیوں میں یہ لوگ قہوہ پی رہے ہیں نیچے سڑک پر گورنر کی جھنڈے والی کار کھڑی تھی اور اسی بلڈنگ میں فرحت صاحب سے بڑے اور کئی افسر بھی موجود تھے مگر گورنر صاحب صرف فرحت صاحب کو مل کر واپس چلے گئے۔

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

انفارمیشن سروس اکیڈمی ہی میں ہمارے اور ساتھی بھی تھے جن سے اس دور میں قائم ہونے والے مراسم آج تک قائم ہیں۔ خواجہ اعجاز سرور اور سعادت اللہ خان سے بھی مزاج اور طبیعت کی ہم آہنگی کی بنیادی وجوہات یہ تھیں کہ ہم لوگ جدید قدروں کے ساتھ قدیم روایات کے احترام کا جذبہ بھی دل میں رکھتے تھے۔ سعادت اللہ خان آج کل ڈی آئی جی پولیس ہیں کیونکہ انہوں نے سی ایس ایس کے امتحان میں دوبارہ شریک ہو کر پولیس گروپ میں ملازمت حاصل کر لی تھی اور سقوط ڈھاکہ کے وقت مشرقی پاکستان ہی میں تھے چنانچہ جنگی قیدی بھی رہے۔ خواجہ اعجاز سرور آج کل حکومت پاکستان کے پرنسپل انفارمیشن آفیسر ہیں۔ راحت کاظمی بھی ان دنوں اکیڈمی ہی میں زیر تربیت تھے مگر ان سے اس قدر ہم آہنگی نہیں تھی جتنی ان احباب سے تھی۔ راحت فلم اور ٹی وی میں چلے گئے اور وہاں انہوں نے بڑا نام پیدا کیا۔

مشرقی پاکستان کے دورے میں مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ یہاں آئندہ اپنے ملک کے ایک حصے کے طور پر آنا نصیب نہ ہو گا بھارتی سازشوں کا اثر و نفوذ بہت بڑھ گیا تھا اور لوگوں کے افلاس کو بنیاد بنا کر مغربی پاکستان کے خلاف نفرت پیدا کی جا رہی تھی۔ پاکستان اور نظریہ پاکستان کے خلاف جو لٹریچر کلکتہ میں چھپتا تھا اسے مشرقی پاکستان کے کونے کونے میں پھیلایا جا رہا تھا ایک لاوا تھا کہ گویا پک رہا تھا مگر اس کا تدارک کرنے والا کوئی نہ تھا حالانکہ میں نے دیکھا کہ تعمیر و ترقی کا جس قدر کام ایوب دور میں ہوا اور نیا ڈھاکہ جس کی زندہ مثال تھا اس کو بھی سیاست کی بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا لوگوں کی غربت کا یہ حال تھا کہ بچے چھ آنے یومیہ' عورتیں آٹھ آنے اور مرد بارہ آنے لے کر پورے پورے دن چائے کے کھیتوں میں کام کرتے تھے عورتوں کو جوتے تو کجا ساریوں کے نیچے بلاوز تک میسر نہ تھے چٹاگانگ کے بازاروں میں میں نے دیکھا کہ لوگ دیدہ و دانستہ کاروں سے ٹکرا جاتے تاکہ کار والا انہیں کچھ معاوضہ دے کر اپنی جان چھڑا سکے۔ مشرقی پاکستان کے ہر شہر اور قصبے میں سائیکل رکشا کھینچنے والے انسان ہی ہوتے تھے جو دن بھر اپنی عزت نفس مجروح کر کے اور اپنی صحت کو داؤ پر لگا کے

اتنا پیسہ بھی نہ کما سکتے تھے کہ دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھا سکیں میں ڈھاکے کے سرکٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا شام کو ٹہلتا ہوا بیت المکرم کی طرف جا نکلا واپسی پر ایک رکشتہ والے کو بلایا اور سرکٹ ہاؤس کا کرایہ پوچھا تو اس نے ڈیڑھ روپیہ طلب کیا میرے ساتھ کافی بحث و تمحیص کے بعد وہ آٹھ آنے میں مجھے سرکٹ ہاؤس لانے پر تیار ہو گیا مجھ جیسی بھاری بھرکم لاش کو وہ نحیف و نزار انسان ہانپتا کانپتا جب سرکٹ ہاؤس لے آیا تو میں نے اسے پانچ روپے کا نوٹ دیا جس پر اس نے کہا کہ نوٹ بھنانے کے لئے باقی پیسے اس کے پاس نہیں ہیں۔ جب میں نے اس سے کہا وہ نوٹ رکھ لے تو اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ شخص جو نہایت حجت سے کرایہ طے کر کے آٹھ آنے میں یہاں آیا ہے وہ اسے پانچ روپے کیسے دے گا اس شخص کی آنکھوں سے ایک دم آنسو گرنا شروع ہو گئے چنانچہ آج بھی مجھے وہ لمحہ یاد آجاتا ہے تو آبدیدہ ہو جاتا ہوں۔

روانگی سے پہلے میں چیف سیکریٹری جناب شفیع الاعظم سے ملا وہ مجھ سے میرے دورے کے تاثرات پوچھتے رہے میں نے ان سے جہاں اور بہت سی باتیں کیں وہاں انسانوں کے ذریعہ کھینچی جانے والی سائیکل رکشاؤں کا ذکر بھی کیا اور بتایا کہ پاکستان بننے کے بعد یہی مسئلہ کراچی میں بھی درپیش تھا لیکن اس وقت کے چیف کمشنر جناب اے۔ ٹی نقوی کے زمانے میں ایک پروگرام بناکر ان سائیکل رکشاؤں کی جگہ آٹو رکشا ملکیتی کرایہ داری کی بناپر ڈرائیوروں کو مہیا کر دیئے گئے تھے۔ چنانچہ آج تک کراچی میں یہی آٹو رکشا چل رہے ہیں اسی طرح ڈھاکہ اور دوسرے بڑے شہروں کے لئے ضروری سروے کے بعد ایک مرحلہ وار پروگرام بنایا جا سکتا ہے جس سے نہ صرف رکشہ ڈرائیوروں کی عزت نفس محفوظ ہو گی بلکہ ان کی صحت کو لاحق خطرات دور ہو جانے کے ساتھ ساتھ ان کی آمدنی میں بھی اضافہ ہو گا شہروں کا ٹریفک کا نظام تیز تر ہونے کے باعث لوگ وقت کے ضیاع سے بھی بچ سکیں گے میری تمام باتیں شفیع الاعظم صاحب نے بظاہر توجہ سے سنیں لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ مستقبل کے نقشہ کا انجانا سا خوف ان کے دل و دماغ کو گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ لا اینڈ آرڈر کے مسائل اس قدر سنگین ہو چکے تھے اور سیاسی آویزشوں نے حالات و ماحول میں ایسا

زہر گھول دیا تھا کہ واقعی میری باتیں سیاق و سباق سے ماورا نظر آ رہی تھیں۔ بہرحال میں نے ان سے جناب حمید اختر کی کومیلا اکیڈمی کی تعریف و توصیف کر کے جسے میں نے چند دن قبل ہی دیکھا تھا اجازت چاہی اگلے ہی روز لاہور کے لئے رخت سفر باندھا۔ ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر جناب مسرور حسن خاں صاحب سے ملاقات ہوگئی نہایت رنجیدہ اور یاسیت میں ڈوبے ہوئے نظر آ رہے تھے وہ بھی اسی جہاز سے واپس لاہور آ رہے تھے ان کی گفتگو سے لگا کہ انہیں وطن کے مشرقی بازو سے محرومی کا احساس ہو چکا ہے مجھ سے پوچھنے لگے کہ منصور تمہیں وہ غزل بھی یاد ہے جس کا مطلع ہے

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ وہ تو رہا نہ وہ میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

سراج اورنگ آبادی کی اس غزل کے دو ایک شعر مجھے یاد تھے وہ میں نے انہیں وہیں سنا دیئے اور واپسی پر انہیں پوری غزل لکھ بھیجی لیکن میں سوچتا رہا کہ اس ذہنی کیفیت میں جو میں نے محسوس کی تھی انہیں آخر سراج اورنگ آبادی کی یہ غزل ہی کیوں یاد آئی۔ حقیقت میں سراج کی یہ غزل کیا ہے رنج و محرومی میں ڈوبا ہوا ایک نوحہ ہے ایسا ہی نوحہ جو غزل کی صورت میں غالب نے ۱۸۵۷ کی ہولناک تباہ کاریوں کے بعد کہا تھا کہ

ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

ادب میں یاسیت

چنانچہ مشرقی پاکستان جدا ہو جانے کا حادثہ بھی میرے راولپنڈی کے دوسری بار

قیام کے دوران پیش آگیا اس بار اس لٹریچر میں جو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے نتیجہ میں تخلیق ہوا تھا اور اب لکھا گیا بعد المشرقین تھا حزن و مایوسی ہمارے اہل قلم کے اذہان کو اپنی گرفت میں لے چکے تھے اور ہر چند کہ از سر نو تعمیر کے ایک دور کا آغاز کیا گیا لیکن وہ زخم جو لگ چکے تھے بہت گہرے تھے اور ان کے مندمل ہونے کے لئے وقت درکار تھا۔ ریڈیو پاکستان کے ایک مشاعرہ میں جو اشعار میں نے پڑھے ان میں مندرجہ ذیل شعر اس حقیقت کی غمازی کر رہا تھا

کھلے ہیں پھول مگر فرصت بہار کہاں
ابھی تو تازہ ہیں سینوں میں زخم بے مرہم

درس و تدریس کے بعد اگرچہ میری پسند کا دوسرا شعبہ انفارمیشن تھا کیونکہ قلم اور اہل قلم دونوں سے تعلق باقی رہنے کی گنجائش موجود تھی لیکن نہ جانے کیوں پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنے فرائض منصبی ادا کرکے وہ طمانیت اور ضمیر کا سکون میسر نہیں آرہا جس سے میں ہمیشہ فیضیاب رہا ہوں میرے ذہن کا یہ اضطراب دن بدن بڑھتا ہی رہا چنانچہ میں نے وزارت خزانہ میں ڈائریکٹر نیشنل سیونگز کی مرکزی پبلک سروس کمیشن سے مشتہر کی جانے والی آسامی کے لئے درخواست گذار دی اور کیونکہ میرے کیریئر میں یہ تبدیلی مشیت کو منظور تھی اس لئے صرف ایک ہی آسامی کے لئے سخت ترین مقابلہ ہونے کے باوجود میں منتخب ہو گیا اور مجھے کراچی جاکر صوبہ سندھ و بلوچستان کے ڈائریکٹوریٹ کا چارج سنبھالنے کا حکم صادر ہوا۔ البتہ عمر کا بیشتر حصہ ملک کے وسطی اور شمالی علاقوں میں گذارنے کے بعد بادل ناخواستہ کراچی جانے سے پہلے مجھ سے ایک ایسا کام سرزد ہوا،جس کی مجھے آج تک خوشی ہے۔ ایران سے قریبی تعلقات کی بنا پر پاکستان میں بھی دو ہزار سالہ جشن شہنشاہیت ایران کا غلغلہ تھا حکومت کی سرپرستی میں ہر جگہ تقاریب منعقد کی جارہی تھیں اور لکھنے والوں کو شہنشاہیت کے ترانے گانے پر راغب کیا جارہا تھا میرے لیے مشکل یہ تھی کہ راولپنڈی ڈویژن میں محکمہ اطلاعات کا سربراہ ہونے کے ناطے مجھے بھی اس مہم میں
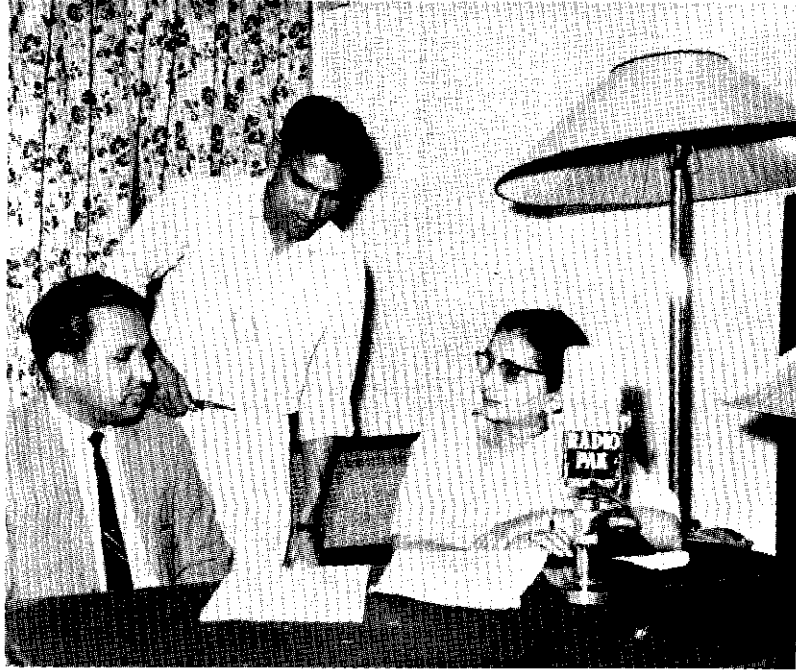
ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے ادبی گفتگو (۱۹۶۵)

حصہ لینا تھا جو حقیقتاً" میرے ضمیر پر بوجھ تھا کہ ایک جمہوری ملک کے شہری کی حیثیت سے شہنشاہیت کا جشن منانا میرے بنیادی تصورات کے منافی تھا خوش قسمتی سے میرے ذہن میں ایک ایسی تجویز آئی کہ جو منشائے سرکار کے بھی منافی نہیں تھی اور مجھے گریز کا موقع فراہم کرتے ہوئے ایک خالص علمی خدمت انجام دینے کی سعادت کی بشارت دے رہی تھی چنانچہ میری اس تجویز سے ڈویژنل انتظامیہ نے جس کے روشن خیال سربراہ جناب رفیق عنایت مرزا تھے اتفاق کیا کہ راولپنڈی ڈویژن کے فارسی گو شعراء کا انتخاب کلام مرتب کرکے شائع کیا جائے اور اسے جشن سے معنون کر دیا جائے اس سے پہلے اس نوع کا کام جناب محمد اکرام (مصنف آب کوثر و رود کوثر) نے ۱۹۴۸ء میں پاکستان میں شہنشاہ ایران کی پہلی بار آمد کے موقع پر انجام دیا تھا ان کی کاوش جو "ارمغان پاک" کے نام سے منظر عام پر آئی آج تک اک بلند پایہ علمی دستاویز کی حیثیت سے منفرد مقام رکھتی ہے۔ بہرحال ایک محدود سطح پر ہی سہی مجھے بھی یہ کام اپنے ایک رفیق دیرینہ جناب ظہور الحسن ارزش کے تعاون سے انجام دینے کا موقع ملا چنانچہ "مبارک نامہ" کے نام سے راولپنڈی ڈویژن کے شعراء کے فارسی کلام کا جو انتخاب پیش کیا گیا اس کی ملک کے علمی حلقوں میں زبردست پذیرائی کی گئی بلکہ ایران کے اخبارات و رسائل میں "مبارک نامہ" پر جو تبصرے شائع ہوئے ان میں مبارک نامے کے شعراء کی فارسی شاعری کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔

اس سلسلہ میں پاکستان ٹیلی وژن نے انٹرکونٹی نینٹل ہوٹل راولپنڈی میں ایک کل پاکستان فارسی و اردو محفل مشاعرہ سجا ڈالی جس کی صدارت حکومت پاکستان کے وزیر اطلاعات و نشریات جناب کوثر نیازی نے کی اور سفیر کبیر ایران بطور مہمان خصوصی رونق افروز ہوئے ہوٹل کا خوبصورت ہال راولپنڈی اسلام آباد کی ممتاز ترین شخصیتوں اور اہل علم و قلم سے بھرا ہوا تھا راولپنڈی میں میں نے اس سے پہلے کبھی اس سے زیادہ خوبصورت ادبی محفل نہیں دیکھی۔ آغا بابر نے جو منتظمین کے سرخیل تھے اچانک اصرار کرکے سٹیج میرے سپرد کر دیا چنانچہ راولپنڈی اسلام آباد کے ادبی حلقوں سے متعلق جو لوگ مجھے جانتے تھے ان کے لئے تو یہ صورت تعجب کا باعث نہ تھی البتہ بیشتر سرکاری افسران مجھے اس حیثیت سے نہیں جانتے تھے چنانچہ ان کے لئے

مجھ ایسے سرکاری افسر کا سٹیج کی کارروائی کو منظوم انداز میں چلانا باعث حیرت تھا کیونکہ ہر آنے والے شاعر کا تعارف میں قطعات یا اشعار کی صورت میں کرا رہا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں منصور تابش نے جو ریڈیو پاکستان سے وابستہ تھے مشاعرہ کے آغاز ہی میں اپنی باری پر سٹیج پر آنے کے بعد کہا کہ آج معلوم ہوتا ہے کہ منصور عاقل صاحب بڑی تیاری کرکے آئے ہیں مجھے ان کی اس بات سے تعجب بھی ہوا اور دکھ بھی لیکن اگلے شاعر ہی سے تعارف کا انداز بدل کے بدیہہ گوئی کا رخ شاعر کے کلام پر منظوم تبصرے کی طرف منتقل کر دیا یعنی شاعر کی غزل یا نظم کے اپنے ردیف قافیہ میں ایک یا دو شعر برجستہ کہہ کر منصور تابش کے خیال کی تردید کر دی جس سے محفل کا رنگ ہی بدل گیا اور یہ تمام پروگرام ٹیلی وژن سے نشر ہوا۔

زبردست چیلنج

بہرحال راولپنڈی کے ادبی و شعری ہنگاموں کے بعد جب میں کراچی آیا تو یہاں زندگی کا رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا کیونکہ چارج سنبھالتے ہی میں نے محسوس کیا کہ میرا نیا منصب میرے لئے ایک زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۹۷۳ء کے پاکستان میں کوئی نیشنل سیونگز کو مالیاتی یا بینکنگ کے ادارہ کی حیثیت سے نہیں جانتا تھا حکومت کے جاری کردہ بانڈز یا سرٹیفکیٹس کی خرید و فروخت کا کام زیادہ تر ڈاک خانوں اور بینکوں کے ذریعہ ہوتا تھا تمام ملک میں قومی بچت کے مراکز کی کل تعداد دس یا بارہ سے زیادہ نہ ہوگی۔ اور وہ بھی ایسی شکل میں کہ لوگوں کو ادارہ کے اصل کردار کے بارے میں باور کرانا بڑا ہی مشکل کام تھا۔ چنانچہ میں نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد اپنی زندگی سے دن رات کی تخصیص مٹا کر اپنے چند ساتھیوں کی رفاقت و تعاون کے ساتھ دیکھتے دیکھتے تمام کراچی اور اندرون سندھ میں نہ صرف مراکز قومی بچت کا جال بچھا دیا بلکہ انہیں سٹاف اور ضروری سازو سامان سے اس طرح مرصع کیا کہ بینکوں کو گھبراہٹ ہونے لگی اور بینکنگ کونسل کے چیئرمین نے وزارت خزانہ کو لکھا کہ آپ نے کس شخص کو کراچی بھیج دیا ہے کہ ہمارا کاروبار ٹھپ ہونے لگا ہے لیکن کیونکہ

وفاقی وزیر اطلاعات مولانا کوثر نیازی کی زیرصدارت ہوٹل انٹرکانٹیننٹل راولپنڈی میں
پاکستان ٹیلی ویژن کے زیراہتمام محفل مشاعرہ میں غزل پڑھتے ہوئے (۱۹۷۱ء)

میرا کام مینڈیٹ کے عین مطابق تھا اس لئے بینکوں کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ بچت کے سرکاری سرٹیفکیٹس اور بانڈز وغیرہ کی فروخت میں زیادہ توجہ اور محنت سے کام کریں اور مراکز قومی بچت سے بہتر عوام کو سروس مہیا کریں۔ لیکن محکمے کے کارکنوں کی جو ٹیم کراچی اور سندھ میں جس خلوص اور جذبے سے مصروف عمل ہو چکی تھی اسے شکست دینا آسان کام نہ تھا۔ دیکھتے دیکھتے یہ عمل تمام ملک میں دہرایا گیا۔ جس کے نتیجہ میں ملک کے تمام شہری و نیم شہری علاقوں میں قومی بچت کے مراکز کی ایک بہت بڑی تعداد معرض وجود میں آگئی اور آج یہ ادارہ حکومت کے لئے اندرون ملک بینکوں کے علاوہ حصول زر کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے اپنی اس کارکردگی کے نتیجہ میں زبردست رقابتوں اور منافقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کی تفصیل میں جانا میری زیر نظر تحریر کا موضوع نہیں۔

کراچی میں میرے پرانے رفیق مظفر ضیاء بھی تھے اور اب وہ کلکٹر کسٹمز بن چکے تھے انہیں کسٹمز کلب کے ذریعہ ادبی و شعری سرگرمیوں کو فروغ دینے کا موقع ملا۔ چنانچہ ان کے زیر انتظام یاد گار قسم کے مشاعرے منعقد ہوئے جن میں میں شریک ہوا چنانچہ اس طرح ان دوستوں کو میرے کراچی آنے کا علم ہو گیا جو مجھے ابھی تک لاہور یا راولپنڈی کا باسی سمجھے بیٹھے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح کسی لائف انشورنس کے ایجنٹ سے تعارف کے بعد پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے بلکل اسی طرح آپ کی مصروفیات کے باوجود آپ کے شاعر دوست آپ کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتے البتہ اس فرق کے ساتھ کہ انشورنس میں بزنس اور شاعری میں خلوص کا حوالہ ناگزیر ہے۔ چنانچہ اہل قلم دوستوں کے خلوص نے مجھے پابجولاں کر دیا۔

جناب صہبا لکھنوی مدیر افکار نے بے حد اصرار کیا کہ میں اپنا شعری مجموعہ چھپوا دوں بلکہ انھوں نے خود ہی "زیرِ آسماں" نام تجویز کر کے افکار میں پلبسٹی بھی شروع کر دی مگر میں محکمانہ کاموں میں اس بری طرح الجھا ہوا تھا کہ ان کے ارشاد کی تعمیل تو کیا کرتا البتہ برادرم حمایت علی شاعر سے نیشنل سیونگز کے لئے ایک نہایت خوبصورت نغمہ لکھوا لیا جسے اس ملک میں پہلا کمرشل سانگ (تجارتی نغمہ) کہا جاسکتا ہے یہ نغمہ ان دنوں ریڈیو اور ٹیلی وژن سے اسقدر عام اور مقبول ہوا کہ بعض مشاعروں میں

حمایت صاحب سے فرمائش ہونے لگی کہ سنائیے۔

جو پیسہ ہم بچاتے ہیں وطن کے کام آتا ہے

اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ یہ نغمہ اپنے اندر بہترین ادبی اوصاف بھی رکھتا تھا۔ حمایت صاحب ہی نے مجھے ان دنوں ایک مقبول ٹی۔ وی پروگرام "کسوٹی" میں بطور مہمان خصوصی مدعو کیا جس کے وہ میزبان ہوتے تھے اور جناب افتخار عارف اور عبید اللہ بیگ صاحب ماہرین۔ چنانچہ ماہرین سے میں نے جس شخصیت کو بوجھا وہ میرے استاد شمس العلماء تاجور نجیب آبادی مرحوم تھے افتخار عارف صاحب کو بیحد ملال تھا کہ تاجور صاحب کا نام ان کی زبان پر آتے آتے رہ جاتا تھا اور اس طرح وہ مطلوبہ شخصیت کو نہ بوجھ سکے۔

نابغۂ روزگار شخصیت

کراچی صدر میں شارع عراق پر سکریٹریٹ بلاک نمبرا۔ ۶۴ میں میرا دفتر واقع تھا اک روز جناب ممتاز حسن تشریف لے آئے اور پہلے دن ہی مجھ سے اس شفقت سے ملے جیسے مجھے وہ برسوں سے جانتے ہوں۔ مجھے جناب ممتاز حسن سے یقیناً" برسوں سے عقیدت تھی لیکن غائبانہ ان کی شخصیت، ان کا تبحر علمی اور ملک کے علمی، ادبی، تہذیبی و ثقافتی حلقوں میں ان کا مقام و مرتبہ کسی تعارف کے محتاج نہیں تھے۔ وہ ایک نابغۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ چنانچہ ان کے عظیم تر اوصاف مجھ پر مزید اس وقت منکشف ہوئے جب مرحوم ازراہ عنایت اکثر میرے دفتر تشریف لے آتے اور مجھے ان کی عالمانہ اور بصیرت افروز گفتگو سے استفادہ کا موقع ملتا مجھے ایسا لگتا جیسے کنواں خود پیاسے کے پاس چل کر آگیا ہو۔ ان کی عظمت کے حوالے سے یہ واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولتا کہ ایک روز وہ تشریف فرما تھے میرا چپراسی ان کے لئے گلاس میں پانی لایا۔ پانی پی کر جب گلاس نظر اٹھا کر چپراسی کو دینے لگے تو یک لخت کھڑے ہوگئے گلاس تو میز پر رکھدیا اور میرے چپراسی کو یہ کہہ کر گلے لگالیا کہ بھائی الٰہی بخش مدتوں بعد آپ کو دیکھا ہے آپ کا کیا حال ہے بچے کیسے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس دوران میں بھی

کسٹم سروس کلب کراچی کے زیر اہتمام منعقدہ آل پاکستان مشاعرہ میں غزل سرا (۱۹۷۵ء) سٹیج پر (دائیں سے بائیں) منصور عاقل-جوش ملیح آبادی- مولانا کوثر نیازی (صدر محفل) مظفر ضیاء اور راغب مراد آبادی (زیریں نشست) پر پروفیسر منظور حسین شور- رئیس امرہوی- نامعلوم- طفیل ہوشیارپوری- ماہر القادری-

احتراماً" کھڑا ہوگیا تھوڑی دیر بعد ممتاز حسن صاحب چلے گئے۔ میں نے الٰہی بخش سے پوچھا کہ تم ممتاز حسن صاحب کو کیسے جانتے ہو تو اس نے بتایا کہ جب وہ حکومت پاکستان میں فنانس سکریٹری تھے تو وہ انکا چپراسی تھا چنانچہ میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ ممتاز حسن صاحب نے جس شخص کو اسقدر عزت و احترام سے اور شفقت سے نوازا ہو میں اس سے چپراسی کا کام ہرگز نہیں لونگا۔ اتفاق سے میرے یہاں ایک دفتری کی آسامی خالی تھی میں نے فوراً" اس آسامی پر الٰہی بخش کی تقرری کے احکام جاری کر دیئے اور ایک چھوٹے سے کمرے میں میز کرسی دے کر بیٹھا دیا۔

ممتاز حسن صاحب خود تو صاحب علم و فضل تھے ہی لیکن دیگر اہل علم کی بھی بے حد قدر کرتے تھے میرے ایک دوست ظفر صدیق میرے پاس دفتر میں بیٹھے تھے کہ ممتاز حسن صاحب تشریف لے آئے میں نے تعارف کرایا اور بتایا کہ ظفر صاحب مشرقی پاکستان میں تھے۔ وہاں سے اجڑ کر یہاں پہنچے ہیں۔ تاریخ گوئی میں کمال رکھتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ظفر صاحب جیسے تاریخ گو شاید کم ہونگے جب میں مشرقی پاکستان گیا تھا تو وہ ان دنوں چٹاگانگ میں تھے اور مظفر ضیاء بھی ان دنوں اسٹنٹ کلکٹر کسٹمز کے طور پر وہیں تعینات تھے چنانچہ اس سے قبل اور بعد میں ظفر صدیقی صاحب سے جب بھی مراسلت ہوئی ان کے خطوط کی عبارت کے ہر جملے سے تاریخ نکلتی تھی یہی نہیں بلکہ اکثر و بیشتر خطوط پر جو پتہ وہ تحریر کرتے تھے اس میں بھی یہی اہتمام نظر آتا تھا اور یہ واقعی ایک بہت بڑا علمی کارنامہ تھا۔ ظفر صاحب اشعار میں بھی نہایت خوبصورت تاریخیں کہتے رہے ہیں چنانچہ جناب ممتاز حسن کو جب ان کے ان اوصاف کا علم ہوا تو بہت متاثر ہوئے اور ظفر صاحب سے فرمائش کی کہ وہ ان کی اہلیہ کے لئے تاریخ کہیں۔ جن کا انتقال چند روز قبل ہی ہوا تھا ممتاز حسن صاحب اس صدمہ جانکاہ سے بری طرح نڈھال ہوگئے تھے اتفاق کی بات کہ اگلے ہی روز ظفر صاحب آئے اور ممتاز حسن صاحب کو فارسی کا ایک ایسا مصرعہ تاریخ سنا دیا جو ان کے دل میں اتر گیا اور ممتاز صاحب' ظفر صدیقی کے ایسے گرویدہ و مداح ہوئے کہ وہ اس پیتل کے برتنوں والی دکان پر صدر میں ان کے پاس ضرور جاتے جہاں ظفر صدیقی صاحب نے اپنے معاشی حالات سے مجبور ہو کر ملازمت کرلی تھی۔ ممتاز حسن صاحب وہاں سر

راہے اسٹول پر ان کے پاس بیٹھتے اور اگر ظفر صدیقی چائے منگاتے تو وہیں بیٹھ کر پیتے بھی۔ اللہ اللہ کیسے عظیم لوگ تھے!

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

ظفر صدیقی کے دیئے ہوئے مصرعہ سے تاریخ تو نکلتی ہی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اہلیہ کی موت کے صدمہ جانکاہ کو ممتاز حسن صاحب نے جس طرح اپنے دل و دماغ اور روح میں جذب کر لیا تھا۔ اس کی جاں گسل تفسیر یہ مکمل شعر خود ہی تھا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

انہیں دنوں اتفاق یہ ہوا کہ الطاف علی بریلوی صاحب کی ایجوکیشنل کانفرنس کے اجتماعات ہو رہے تھے جرمن مستشرق ڈاکٹر این۔ مری شمل کے علاوہ ملک کے دوسرے شہروں سے بعض ادباء و شعرا بھی آئے ہوئے تھے جن میں پشاور' راولپنڈی اور لاہور سے ایسے حضرات بھی تھے جن سے میرے خاص مراسم تھے۔ چنانچہ میں نے ان حضرات کو رات کے کھانے اور ایک مختصر شعری نشست پر اپنے ہاں مدعو کر لیا اور چند مقامی دوستوں کو بھی زحمت دی عین اس وقت جب یہ سب حضرات میرے یہاں اکٹھے ہو چکے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو ممتاز حسن صاحب بول رہے تھے کہ "بھئی آپ نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے کیا اپنوں کے غم بٹانے کا یہی طریقہ ہے کہ انہیں غم کی تاریکیوں میں دھکیل دیا جائے اور اس طرح اکیلا چھوڑ دیں کہ کوئی پرسان حال بھی نہ ہو مجھے صہبا صاحب نے بتایا تھا کہ آج شام آپ کے یہاں سب اکٹھے ہو رہے ہیں وہ لوگ آچکے ہونگے آپ میرے لیے ابھی گاڑی بھجوایئے تاکہ میں شریک ہو سکوں" میں اتنا سٹپٹایا اور شرمندہ ہوا کہ مجھ سے

کوئی عذر نہ بن پڑا اور خود گاڑی لیکر پہنچا اور ممتاز حسن صاحب کو لے آیا میں نے ان کو صرف اس خیال سے مدعو نہ کیا تھا کہ چند روز پہلے ہی ان کی اہلیہ کا انتقال ہوا تھا اور وہ غالباً" ان حالات میں تشریف لانا پسند نہ فرماتے۔ بہرحال اس روز رات بارہ بجے کے بعد تک وہ نشست رہی جس میں مجھے پہلی بار علم ہوا کہ ممتاز حسن صاحب شاعر بھی ہیں اور ان سے نہایت خوبصورت نظمیں سنی بھی' اب جبکہ ممتاز حسن صاحب زندہ نہیں ہیں تو ان کی ایک ایک بات یاد آ رہی ہے صرف ایک مزید واقعہ سنانے پر اکتفا کرونگا۔ جس سے ان کی جودت طبع اور طنز کی کاٹ لیے ہوئے بزلہ سنجی کا اظہار ہوتا ہے انہیں کی موجودگی میں میرے ایک صحافی دوست کا روالپنڈی سے فون آگیا اور مجھے بتایا گیا کہ مولوی سید نجی اللہ جو انگریزی صحافت سے وابستہ تھے اور بالعموم مالیاتی و معاشی موضوعات پر کالم لکھتے تھے انہیں حکومت پاکستان میں فنانس سکریٹری بنا دیا گیا ہے۔ (اصل میں انہیں ایڈیشنل فنانس سکریٹری مقرر کا گیا تھا) تو میں بہت ہنسا بات ختم ہوئی تو ممتاز حسن صاحب نے میرے ہنسنے کا سبب پوچھا میں نے واقعہ سنایا تو بولے تھوڑی دیر میں ایک فون اور آئیگا اور یہ کہ بھولو پہلوان کو فوج کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا ہے۔

داعیان نظم و غزل کی چشمک

میں کراچی میں ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۷ء تک چار سال رہا لیکن اس تمام مدت میں زیادہ تر توجہ محکمانہ امور پر مرکوز رہی کیونکہ نیشنل سیونگز کو فروغ دینے کا ایک عجیب سا جذبہ مجھے اپنے رگ وپے میں موجزن محسوس ہوتا تھا اس سلسلہ میں جناب آئی۔اے خان صاحب (جناب افتخار احمد عدنی) سے شرف ملاقات حاصل ہوا وہ وہاں کیبنٹ ڈویژن کے جوائنٹ سکریٹری کے منصب پر فائز تھے اور ان انتظامات کے نگران تھے جن کے تحت شارع عراق والے سکریٹریٹ بلاکس کو مرکزی حکومت کے محکموں سے خالی کرا کر سندھ کی صوبائی حکومت کے سپرد کیا جا رہا تھا اور مرکزی محکموں کے لئے متبادل انتظامات کیے جارہے تھے میرے دل میں عدنی صاحب کے سرکاری منصب

سے کہیں زیادہ ان کی خاندانی نسبت کا احترام تھا کہ وہ نواب اسمٰعیل خان صاحب جیسے
بطل جلیل کے فرزند تھے چند ملاقاتوں ہی میں مجھے ان کی شفقت کا احساس ہونے لگا
جس کا سب سے بڑا فائدہ میرے محکمے کو یہ ہوا کہ انھوں نے ہمیں سکریٹریٹ بلاک نمبر
اے۔ ۴۶ کے چند کمروں سے منتقل کرکے شارع فیصل (سابق ڈرگ روڈ) پر پچاس
کمروں پر مشتمل پانچ منزلہ خوبصورت عمارت الاٹ کر دی تاکہ محکمے کے مستقبل کی
ضروریات کی بھی کفالت ہوسکے چنانچہ یہ عمارت جو نیشنل سیونگز ہاؤس کے نام سے
موسوم ہے آج بھی کراچی میں محکمے کا بھرم قائم رکھے ہوئے ہے۔

عدنی صاحب بھی بنیادی طور پر علمی و ادبی ذہن کے مالک ہیں چنانچہ کیبنٹ
ڈویژن کے تحت منعقد ہونے والی اکثر تقاریب میں مجھے مدعو کرتے نجی محفلوں میں بھی
مجھے شرکت کا موقع ملا ایک روز فون آیا کہ آج رات آپ کھانے پر آجائیں کچھ شعر
و شاعری بھی ہوگی کیونکہ جسٹس انوارالحق صاحب آئے ہوئے ہیں کچھ اور احباب کو
بھی بلایا ہے چنانچہ مجھے بھی یہ ڈیوٹی سونپی گئی کہ اپنی گاڑی میں فضل احمد کریم فضلی
صاحب کو لیتا آؤں وہ میرے سوسائٹی والے گھر کے قریب ہی رہتے تھے اور غزل سے
اپنی بے پناہ عقیدت کے تحت انھوں نے اپنے مسکن کو "بیت الغزل" کے نام سے
منسوب کیا ہوا تھا۔ میری ان سے ملاقات تھی ہی چنانچہ شام سات بجے میں نے انھیں
بیت الغزل سے لیا اور راستے میں حسب معمول جو گفتگو رہی اس میں اس بار جوش
صاحب کا عنصر غالب تھا۔ فضلی صاحب اور جوش صاحب کے درمیان غزل کے معاملے
میں ہمیشہ چشمک رہی۔ جوش صاحب کی پوری رباعی تو مجھے یاد نہیں البتہ اس کا ایک
چبھتا ہوا شعر یاد ہے کہ

بو آئی جو فرسودہ غزل بافوں کی
میں راستے سے ناک بند کرکے گذرا

اور فضلی صاحب کا ایک جواب "ماہ نو" کی کسی پرانی اشاعت میں شائع ہوا تھا جس کا
یہ شعر مجھے آج تک یاد ہے۔
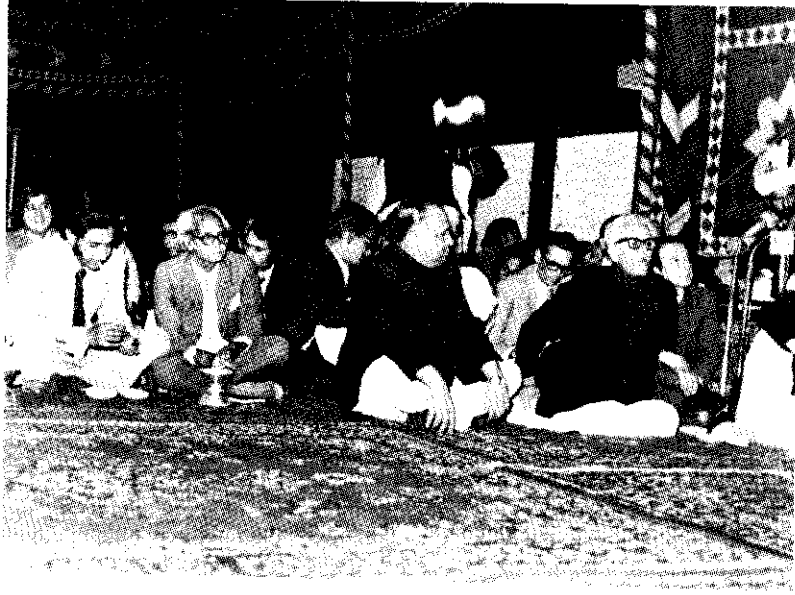
کراچی کی ایک محفل مشاعرہ میں شعراء کے درمیان (۱۹۷۴ء) تصویر میں فیض بخشا پوری۔ سید ہاشم رضا۔ اقبال عظیم۔ شبنم رومانی۔ حمایت علی شاعر۔ منصور عاقل (مصنف) پیکر واسطی۔ محشر بدایونی اور تابش دہلوی نمایاں ہیں

مصنف کی ایک کتاب "برگ سبز" کی تقریب تعارف کے سلسلہ میں کراچی میں محفل مشاعرہ (۱۹۹۲ء) (دائیں سے) حسین انجم، مہتاب ظفر، نجمہ خان، منصور عاقل، جسٹس (ریٹائرڈ) ایس اے نصرت (صدر محفل) مظفر ضیاء۔ صہبا اختر اور محسن بھوپالی۔

ہر اک کی دسترس میں کہاں سر دلبراں
وہ نظم گو ہوا جو غزل خواں نہ ہو سکا

بہرحال راستے میں فضلی صاحب نے جوش صاحب کے بارے میں اپنی ایک رباعی سنائی جس کا مصرعہ آخر جوش صاحب کا تھا اور ان کے مذہب سے مخصوص باغیانہ انداز کو ظاہر کرتا تھا اور ان کے مزاج و طبیعت میں تکبر کی آمیزش کو بھی خوبی یہ تھی کہ فضلی صاحب کی رباعی کے تینوں مصرعے جوش صاحب کے مخصوص ڈکشن ہی میں تھے ظاہر ہے کہ یہ رباعی فضلی صاحب کے مطبوعہ کلام کا حصہ نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس کا یہاں ذکر کر دینے میں کوئی مذائقہ نہیں فرماتے ہیں۔

فرعون کی ڈوبی ہوئی سطوت کی قسم
شداد کی کھوئی ہوئی جنت کی قسم
میں بھی ہوں اسی زمرہ عظام میں جوش
"ابلیس و ابوجہل کی عظمت کی قسم"

"برگ سبز" کی تقریب تعارف

چار سال کے دوران قیام اہل کراچی سے محبت و اخلاص کے جو رشتے قائم ہوئے وہ آج تک قائم ہیں حد یہ ہے کہ جو کتاب میں نے اسلام آباد میں بیٹھ کر مرتب کی اور جسے یہیں سے طبع کرایا اس کی تقریب تعارف کراچی کے دوستوں نے ۱۹۹۲ء میں کراچی میں بڑی دھوم دھام سے منعقد کرادی اس سلسلہ میں میں مظہر جمیل صاحب اور مسلم شمیم صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اردو انٹرنیشنل کے زیر اہتمام "برگ سبز" کی تقریب تعارف میں اپنا بھرپور کردار ادا کرکے اسے یاد گار بنا دیا۔ تقریب دو حصوں پر مشتمل تھی پہلی نشست میں مقالات و تقاریر جس میں دیگر حضرات

کے علاوہ جناب حسین انجم اور ڈاکٹر نوازش رضا صاحب نے نہایت پر مغز اور فکر انگیز مقالات پڑھے۔ دوسری نشست مشاعرہ جس میں کراچی کے تقریباً تمام ہی قابل ذکر شعراء نے شرکت کی اور یہ محفل بعد میں کم و بیش ایک گھنٹہ کے دورانیہ پر مشتمل ایس۔ ٹی۔ این (ٹیلیوژن) سے ٹیلی کاسٹ کی گئی۔ صدر محفل جناب جسٹس ایس۔ اے نصرت کو بحیثیت شاعر میں نے پہلی بار سنا اور بہت محفوظ و متاثر ہوا۔

تبادلوں کے ہاتھوں دربدری

ملازمت میں تبادلوں کے پے بہ پے سلسلوں نے مجھے جہانیاں جہاں گشت بنائے رکھا شادی سے پہلے تو حالت یہ تھی کہ بستر سوٹ کیس اٹھایا اور چل دیئے مگر شادی کے بعد اور خصوصاً بچوں کی تعلیم شروع ہو جانے کے بعد بار بار تبادلوں کا سلسلہ مہنگا پڑا چنانچہ میری توجہ بچوں کے تعلیمی معاملات کی جانب بھی رہتی تھی کوشش ہوتی تھی کہ یکے بعد دیگرے سکول بدلنے سے بچوں کی تعلیم متاثر نہ ہو بہرحال فرق تو ضروری پڑا مگر بفضل تعالیٰ تینوں بیٹوں نے تعلیم مکمل کرلی۔ بڑا بیٹا فیصل ماشاء اللہ ٹیکسٹائل انجینئر ہے اور گذشتہ جنوری ۱۹۹۴ء ہی میں میں اسکی شادی کے فرض سے بھی سبکدوش ہو گیا ہوں سلمان اور فرحان دونوں بینکنگ کے شعبہ میں چلے گئے ہیں اور بہت مطمئن ہیں سلمان سٹی بینک اور فرحان بینک آف امریکہ میں ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ سرکاری ملازمت کے لئے مقابلے کے امتحانوں کی طرف رجوع کریں مگر لگتا ہے کہ سرکاری ملازمت میں تبادلوں کے ہاتھوں میری دربدری کو دیکھ کر بدظن ہوگئے۔ ویسے بھی آجکل نجی شعبہ کی ملازمتیں تنخواہ ہی نہیں بلکہ ہر اعتبار سے زیادہ پرکشش ہوگئی ہیں اگر یہی صورت حال رہی تو یورپ کے ممالک اور امریکہ کی طرح دوسرے اور تیسرے درجہ کی صلاحتیں رکھنے والے لوگ ہی سرکاری ملازمتوں میں جائیں گے اور اب تک جس طرح ہمارے معاشرہ کا ذہین ترین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ سرکاری ملازمت کو ترجیح دیتا تھا مستقبل میں یہ رجحان نجی شعبہ میں منتقل ہو جائے گا۔ بہرحال بچوں کا ذکر تھا تین بیٹوں کے علاوہ اللہ نے مجھے ایک پیاری سی بیٹی سے بھی نواز ہے۔ صباحت اب دسویں جماعت میں آئی ہے خدا کرے سب خوش نصیب ہوں اور ملک و ملت کے لئے سرمایہ افتخار۔ (آمین)

فیملی گروپ

کھڑے ہوئے (دائیں سے) فیصل منصور، فرحان منصور، سلمان منصور (بیٹے) بیٹھے ہوئے (دائیں سے) ناہید منصور (اہلیہ) صباحت منصور (بیٹی) اور مصنف (۱۹۹۳ء)

آر کائیوز--نیا تجربہ

مرکزی حکومت نے دسمبر ۱۹۷۸ء میں میری خدمات حکومت پنجاب کے حوالے کر دیں وہاں ٹرانسپورٹ کے دو خود مختار اداروں میں مختلف اوقات میں فنانس کے شعبہ کا سربراہ رہا لیکن صوبائی سکریٹریٹ میں میری ایک تقرری بڑے دلچسپ انداز میں محض اس لیے ہو گئی کہ سرکاری ریکارڈ میں میرے ذاتی کوائف میں میرا ایم اے (تاریخ) ہونا بھی درج تھا چنانچہ مجھے صوبائی حکومت کا ڈائریکٹر آرکائیوز لگا دیا گیا۔ غالباً" اس غیر پرکشش آسامی کے لیے کوئی تیار نہ ہوتا تھا اس منصب کی نہ کوئی اہمیت تھی نہ شان و شوکت جسے عام طور پر لوگ پسند کرتے ہیں دفتر بھی انار کلی کے مقبرے میں واقع تھا اور لگتا تھا کہ گویا جیتے جی دفن کر دیئے گئے ہیں۔ عملہ بھی حد درجہ پژمردگی اور مایوسی میں مبتلا۔ نہ کوئی کام تھا نہ کاج البتہ چاروں طرف قدیم دستاویزات سے بھری ہوئی الماریاں ہی الماریاں نظر آتی تھیں اس قسم کی آسامی پر کام کرنے کا میرا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے مجھے بھی عجیب سا لگا لیکن چند ہی دنوں میں مجھے اس شعبہ کی اہمیت کا احساس ہو گیا یہ تو علم کا بیش بہا خزینہ تھا بالکل ایسا ہی خزینہ جیسا انڈیا آفس لائبریری لندن مگر ہمارے یہاں تو اختیارات اور دولت کی چمک دمک ہی کو سب کچھ سمجھا جاتا ہے اور یہی ہماری بدقسمتی ہے بہر حال قدرت نے مجھے علمی خدمت پر مامور فرما دیا تھا میں نے دیکھا کہ پنجاب آرکائیوز میں کم و بیش دو سو سال پرانا ریکارڈ موجود تھا اور یہ وہ اہم مواد تھا کہ جسکی بنیاد پر سیکڑوں پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جا سکتے تھے یہ ریکارڈ تہذیبی' ثقافتی' معاشی' معاشرتی' انتظامی اور سیاسی تاریخ کا آئینہ تھا اس کی افادیت اور اہمیت کو سب سے پہلے ۱۹۲۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں تاریخ کے استاد اور انڈین ایجوکیشن سروس کے رکن پروفیسر گیرٹ نے بھانپ لیا تھا اور انھوں نے اس وقت کے پنجاب کے گورنر سرایڈورڈ میکگلن کی اجازت سے اسے ترتیب دیا۔ میں جب وہاں ۱۹۸۱ء میں تعینات ہوا تھا تو اس وقت پنجاب آرکائیوز میں کم و بیش ستر لاکھ فائلیں موجود تھیں اور لائبریری میں اسی ہزار کتب کے علاوہ پانچ ہزار ایسی کتب اور دستاویزات بھی موجود تھیں جو قلمی نسخوں اور فرامین

شاہی وغیرہ پر مشتمل تھیں اس اعتبار سے پنجاب کے آرکائیوز کو ملک کے قدیم ترین آرکائیوز ہی نہیں بلکہ سب سے بڑے اور برصغیر میں دہلی آرکائیوز کے بعد دوسرے نمبر پر قرار دیا جا سکتا ہے ان میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد دہلی ریزیڈنسی سے منتقل کیا ہوا ریکارڈ۔ صوبہ سرحد کا وہ تمام ریکارڈ جب وہ پنجاب کا حصہ تھا۔ ۱۸۴۳ء میں سرچارلس نیپیئر کے صوبہ سندھ پر قبضہ کے وقت سے اس وقت تک کا تمام ریکارڈ جب سندھ بمبئی ریذیڈنسی کا حصہ قرار پایا اور اسکے علاوہ بلوچستان کے قبائلی علاقوں' جموں و کشمیر نیز بعض مشرق وسطی کی ریاستوں کی اہم دستاویزات شامل تھیں۔ ۱۹۵۵ء میں جب مغربی پاکستان کا صوبہ معرض وجود میں آیا تو سابقہ تمام صوبوں اور ریاست بہاولپور کا اہم ترین سرکاری ریکارڈ بھی لاہور منتقل کر دیا گیا لیکن بدقسمتی سے اس کا بیشتر حصہ عدم توجہی کا شکار ہو کر ضائع ہو گیا۔ بہر حال بہاولپور کے ریکارڈ آفس میں جسے "محافظ خانہ" کہا جاتا تھا کم و بیش ڈھائی لاکھ فائلیں محفوظ تھیں ان کے علاوہ تاریخی اہمیت کے مخطوطات شاہی فرامین اور سکے وغیرہ ابھی دستبرد زمانہ سے بچے ہوئے تھے۔ ان میں سب سے قیمتی محفوظہ "صادق الاخبار" کی فائلیں تھیں جو بہاولپور کی سماجی معاشی' سیاسی و مذہبی حتیٰ کہ دفتری احکامات اور افسران کے تقرر اور تبادلوں کی مکمل تاریخ کو احاطہ کیے ہوئے تھیں انھیں دنوں مین بہاولپور گیا اور دیکھا کہ یہ تمام تاریخی و ثقافتی ورثہ انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں پڑا ہوا ہے بلکہ مجھے یہاں تک بتایا گیا کہ بہت کچھ بطور ردی بھی فروخت کیا جا چکا ہے اس وقت کے کمشنر بہاولپور چوہدری محمد شریف کے علم میں جب یہ اندوہناک صورت حال لائی گئی تو انھوں نے ایس۔ ای کالج بہاولپور کے ایک ریٹائرڈ پروفیسر معین قریشی صاحب کو اجازت دے دی کہ وہ اس ریکارڈ کی تدوین و تنظیم کا کام کریں مگر مجھے صدمہ ہوا جب میں نے یہ دیکھا کہ یہ تمام ریکارڈ پروفیسر صاحب کی ذاتی نگرانی میں ہونے کے باوجود بعض نہایت قیمتی دستاویزات سے محروم ہوچکا ہے۔ جنہیں سرسید احمد خاں اور جسٹس امیر علی مرحوم جیسے مشاہیر کے خطوط بھی شامل تھے چنانچہ میں نے کمشنر کو مشورہ دیا کہ وہ پروفیسر صاحب کو فوراً فارغ کردیں اور میں پنجاب آرکائیوز کی جانب سے ایک ریسرچ آفیسر' مختصر عملہ اور ریکارڈ کو محفوظ کرنے کے لے ضروری سازوسامان مہیا کیے دیتا ہوں۔ چنانچہ یہ اقدام

کرنے میں مجھے ایڈیشنل چیف سکریٹری پنجاب جناب سجاد الحسن کی مکمل سرپرستی حاصل رہی کیونکہ وہ خود بھی ایک علم دوست شخصیت تھے۔ کمشنر چوہدری شریف صاحب نے بھی بھرپور تعاون کیا لیکن میرے واپس وفاقی حکومت چلے آنے کے بعد مجھے یہ جان کر انتہائی صدمہ ہوا کہ آرکائیوز کا وہ چھوٹا سا دفتر جسے میں بہاولپور میں قائم کر آیا تھا ختم کر دیا گیا ہے۔ بعدازاں محافظ خانے کی دستاویزات کا کیا حال ہوا یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

پنجاب آرکائیوز میں جب تک میں رہا اس شعبہ کو از سرنو منظم کرنے میں مصروف رہا چنانچہ دیکھتے دیکھتے وہاں علمی تحقیق کی ایک فضا قائم ہو گئی اور ریکارڈ کے نظم و ترتیب میں جو خامیاں تھیں انھیں بھی دور کر لیا گیا نیز ریکارڈ کی مائیکرو فلمنگ اور مائیکروفش کے عوامل کو تیز تر کر دیا گیا مقامی سکالرز پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے مشورے سے طلباء اور محققین کے لیے مطالعہ و تحقیق کے معقول انتظامات کر دیئے گئے میرے ہی دور میں کیلی فورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر گل مارٹن آئے اور انہوں نے اپنا مقالہ بعنوان "پنجاب میں تحریک پاکستان اور مذہبی قیادت" مکمل کیا۔ مرحوم حامد جلال صاحب کی صاحبزادی جو پیرس میں اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے پر کام کر رہی تھیں جب انہیں پنجاب کے اس خوبصورت ذخیرہ علمی کا علم ہوا تو وہ لاہور آئیں اور تقریباً" دو یا تین ماہ پنجاب آرکائیوز مین بیٹھ کر اپنا مقالہ مکمل کیا۔ اپنی تعیناتی کی مختصر مدت میں میری یہ بھی کوشش رہی کہ ضلعی صدر مقامات پر ڈپٹی کمشنروں کے ذریعہ کمیٹیاں قائم کر کے اضلاع میں تاریخی ریکارڈ کو محفوظ کر لیا جائے مگر

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

تاہم قومی سطح پر اس ضمن میں مجھے کام کرنے کا جو موقع ملا وہ آج بھی میرے لیے طمانیت کا باعث ہے اپریل ۱۹۸۱ء میں اس موضوع کی بے پایاں اہمیت کو محسوس کرتے

ہوئے صدر مملکت نے قومی آرکائیوز کی پالیسی بنانے کے لیے ایک مشاورتی کمیٹی تشکیل دی جس کا چیئرمین ڈاکٹر محمد افضل صاحب کو مقرر کیا گیا جو اس وقت یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئرمین بھی تھے اور بعد میں وزیر تعلیم بھی رہے یہ کمیٹی ملک کے نامور مورخین' محققین اور سکالروں پر مشتمل تھی چنانچہ پنجاب کے رکن کی حیثیت سے میں نے اس کمیٹی کے تمام کام میں بھرپور حصہ لیا اور اہم تجاویز پیش کیں جنھیں اسقدر سراہا گیا کہ کمیٹی کی رپورٹ لکھنے کا کام ہی تنہا میرے سپرد کر دیا گیا جو الحمداللہ میں نے بخیرو خوبی انجام دیا اور وہ رپورٹ صدر مملکت کو ارسال کر دی گئی ایک اہم بات اس ضمن میں یہ تھی کہ میں نے قومی ورثہ کے تحفظ کے لیے جس میں ملک بھر کے کتب خانے' عجائب گھر' آثار قدیمہ اور آکائیوز شامل تھے ایک سروس گروپ تجویز کیا اور اس کی تمام تفصیلات پر مشتمل ایک پیپر تیار کیا جو مذکورہ رپورٹ کا حصہ بنا دیا گیا مگر افسوس کہ اس رپورٹ پر جو نہایت مفصل اور مفید تجاویز پر مشتمل تھی آج تک کہیں عمل در آمد کے آثار دیکھنے میں نہیں آئے۔

انہیں دنوں مرکزی وزارت ثقافت کے زیر اہتمام آرکائیوز پر پاکستان میں ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد ہوا جس کی تمام نشستوں میں میں نے حصہ لیا اور پنجاب آرکائیوز پر جو پیپر میں نے پڑھا اس پر غیر ملکی مندوبین کی توجہ مرکوز ہو گئی۔ چنانچہ کچھ دن بعد لندن سے انڈیا آفس لائبریری کے ڈائریکٹر مسٹر بلوم فیلڈ میرے پاس لاہور آئے اور دو دن تک پنجاب آرکائیوز کا جائزہ لیتے رہے بعد ازاں انہوں نے اپنے نائب مسٹر مارٹن موئر اور ان کی اہلیہ کو پاکستان بھیجا جنھوں نے پاکستان کے چاروں صوبوں کے آرکائیوز پر رپورٹ مرتب کی ان کا سب سے زیادہ قیام لاہور میں رہا اور پنجاب آرکائیوز ہی کو اپنی تحسین و توصیف کا موضوع بنایا۔ ڈاکٹر سید زوار حسین زیدی بھی جنھوں نے انٹرنیشنل سیمینار میں شرکت کی تھی اور ان دنوں لندن یونیورسٹی کے اسکول آف افریکن اینڈ ایشین سٹڈیز کے استاد تھے لاہور آئے اور پنجاب آرکائیوز پر ایک مکمل وڈیو بنانے کے ساتھ ساتھ میرا مفصل انٹرویو بھی ریکارڈ کر کے لے گئے تھے۔ جو یقیناً" عالمی سطح پر متعلقہ حلقوں تک پہنچا ہو گا۔ بہرحال کچھ تو میرے بعض مضامین جو بیرون ملک رسائل میں چھپے اور کچھ انٹرنیشنل سیمینار میں

میرے مقالے کے حوالے سے مجھے متعدد خطوط ملے جن میں پنجاب آرکائیوز کے بارے میں مزید تفصیلات طلب کی گئی تھیں لاہور سے آنے کے بعد دوبارہ مجھے پنجاب آرکائیوز میں حاضری دینے کا موقع نہیں ملا لیکن جو کچھ سنتا ہوں اسے لکھنے کا حوصلہ نہیں میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ارباب بست و کشا کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ اپنے قومی ورثہ کے تحفظ کا فریضہ انجام دے سکیں ورنہ اس شعبہ سے عدم توجہی ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنا شجرہ نسب گم کر بیٹھے۔

اردو بطور زبان دفتری

اس بار لاہور کے قیام میں مجھے ایک اعزاز اور حاصل ہوا کہ مجلس زبان دفتری کے نام سے وہ ادارہ جسے سردار عبدالرب نشتر موحوم کے حکم سے جب وہ گورنر پنجاب تھے قائم کیا گیا تھا اور جس کے پہلے سکریٹری حکیم احمد شجاع مرحوم تھے میرے سپرد کر دیا گیا۔ چنانچہ مجلس زبان دفتری پنجاب کے سکریٹری کی حیثیت سے دفتری زبان کے طور پر اردو کے فروغ و ارتقا کا کام میرے سپرد ہوا اول تو اس ادارہ نے پہلے ہی بہت قابل قدر کام انجام دیا تھا جس میں دفتری اصطلاحات پر مشتمل اردو لغت کی اشاعت بھی شامل تھی اور ایک ذیلی ادارہ مجلس استناد کے نام سے جو جید اہل قلم اور صاحبان علم پر مشتمل تھا برابر اس لغت پر نظر ثانی کے کام میں مصروف تھا۔ تاہم میں نے محسوس کیا کہ مجلس زبان دفتری کو مزید فعال بنانے کے لیے اس کی تنظیم نو ضروری ہے اور وہ بھی اس انداز سے کہ اردو کے حوالے سے شعرو ادب اور علم و تحقیق کے شعبوں میں جو نمایاں شخصیتیں ہیں انہیں اس سے وابستہ کر لیا جائے تاکہ ایک طرف تو قابل ترین افراد کا تعاون و رہنمائی حاصل ہو جائے اور دوسری طرف دفتری زبان کے طور پر اردو کے نفاذ کے عمل کو تیز تر کیا جا سکے۔ اس مقصد کے پیش نظر مجلس مین جن مشاہیر کو مزید شامل کیا گیا ان میں جناب ڈاکٹر سید عبداللہ (مرحوم) ڈاکٹر ابوالایث صدیقی' ڈاکٹر محمد معزالدین (ڈائریکٹر اقبال اکیڈیمی) جناب احمد ندیم قاسمی اور جناب اشفاق احمد کے علاوہ جناب جاوید احمد قریشی جو اس وقت پنجاب کے سکریٹری

اطلاعات تھے کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں چنانچہ اس وسیع تر مجلس کا اجلاس جناب سجاد الحسن کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں نہایت اہم پالیسی امور طے کیے گئے اور ایسے فیصلے کیے گئے کہ جن کو بنیاد بنا کر مجلس کی سرگرمیوں کو میں نے تیزی سے نہ صرف تمام صوبے میں پھیلایا اور پنجاب سکریٹریٹ میں فوری طور پر اردو کو دفتری زبان کے طور پر استعمال کیا جانے لگا بلکہ مرکز میں کینٹ ڈویژن سے مسلسل رابطہ رکھ کر اور مقتدرہ قومی زبان کے اشتراک وتعاون سے ملک بھر میں قومی زبان کے دفتروں میں نفاذ کے لیے اہم اقدامات کیے۔ مجلس کے اجلاس میں میری تقریر سننے کے بعد جناب ڈاکٹر سید عبداللہ مجھ سے خصوصی شفقت فرمانے لگے اور ہر سطح پر اردو کے نفاذ کے عمل کو آگے بڑھانے میں میری مدد اور رہنمائی فرمائی۔ یہی حسن سلوک مرحوم میجر آفتاب حسن صاحب نے جو مقتدر کے قائمقام صدر نشین تھے مجھ سے روا رکھا۔

اس سلسلہ میں وفاقی حکومت نے وزیر دفاع جناب علی احمد تالپور کی سربراہی میں ایک وسیع تر کمیٹی تشکیل دی جس میں وفاق اور چاروں صوبوں کو نمائندگی دی گئی۔ کیبنٹ ڈویژن نے اس کمیٹی کے اجلاس کا اہتمام اسلام آباد میں کیا چنانچہ اجلاس کے دوران تمام صوبوں میں نفاذ اردو کے سلسلہ میں پیش رفت کا جائزہ لیا گیا کیونکہ یہ ایک آئینی ضرورت تھی اس موقع پر صدر مجلس جناب تالپور نے جن خیالات کا اظہار فرمایامیں اس سے بیحد متاثر ہوا علی احمد تالپور یہی نہیں کہ خود ایک بہت بڑے سکالر تھے بلکہ وہ ایک عظیم محب وطن بھی تھے انہیں احساس تھا کہ ایک مشترکہ زبان ہی ہمارے قومی تشخص اور قومی اتحاد کی ضامن ہے دوسری اہم بات یہ کہ دفتری زبان کے طور پر اردو کے نفاذ سے حکومت اور عوام کے درمیان قرابت اور اعتماد کی فضا کو تقویت ملے گی لیکن اجلاس میں بعض ایسے افراد بھی تھے جو ان تمام عوامل کے حوالے سے منفی سوچ رکھتے تھے۔ حالانکہ اجلاس کے دوران میں نے ہی نہیں بلکہ دیگر حضرات بالخصوص میجر آفتاب حسن نے بتایا کہ زبان دفتری کے طور پر اردو کے نفاذ کے نتیجہ میں علاقائی زبانوں خاص طور پر سندھی کے مقام و مرتبہ میں کوئی فرق نہیں پڑیگا۔ کیونکہ اردو کو صرف انگریزی کی جگہ نافذ کرنا مقصود ہے۔ سندھ میں جہاں جہاں سندھی زبان رائج ہے وہ بدستور نافذ العمل رہے گی میں نے بھی

لاہور میں ایک علمی وادبی اجتماع سے خطاب (۱۹۸۱ء) سٹیج پر محترمہ ثاقبہ رحیم الدین-
ڈاکٹر محمد معزالدین اور ڈاکٹر سید عبداللہ تشریف فرما ہیں-

اجلاس کو بتایا کہ ایک ذہنی یا نفسیاتی رکاوٹ کے سوا پورے ملک میں اردو کے نفاذ میں کوئی امر مانع نہیں ہے ہر صوبے میں اردو ٹائپ کاروں اور مختصر نویسوں کی ایک بہت بڑی تعداد تربیت پا چکی ہے بلکہ بلوچستان میں تو مرحوم غوث بخش بزنجو کی گورنری کے دوران ہی اردو کو صوبے کی سرکاری زبان قرار دیدیا گیا تھا- پنجاب جو ملک کا سب سے بڑا صوبہ ہے وہاں پہلے ہی اضلاع اور صوبہ کی سطح پر بیشتر دفتری کام اردو میں انجام دیا جا رہا ہے میں نے ضلعی سطح کی ان کمیٹیوں کا بھی ذکر کیا جو تمام صوبے میں براہ راست میری نگرانی میں کام کر رہی تھیں اس کے علاوہ دفتری الفاظ و اصطلاحات کا ایک عظیم الشان ذخیرہ اردو میں منتقل کیا جا چکا ہے اور اس کے باوجود یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ ایسے انگریزی الفاظ کو بھی اردو میں ترجمہ کیا جائے جو عام طور پر بولے اور سمجھے جاتے ہیں ویسے بھی سکھوں کے دور میں پنجاب میں ۱۸۴۹ء تک فارسی زبان اگر پچاس برس تک حکومتی اور دفتری زبان رہ سکتی ہے تو ہم لوگ اردو کو کیوں نافذ نہیں کر سکتے-

پاکستان میں آج تک دفتری زبان کے طور پر اردو کیوں نافذ نہیں ہو سکی اس کے اسباب کچھ بھی ہوں لیکن اس سے بڑی ہماری قومی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم دیدہ و دانستہ اپنے قومی تشخص کی صورت گری سے گریز کر رہے ہیں- بہر حال ایک کار خیر جو مجلس زبان دفتری کے معتمد کی حیثیت سے میں کر آیا وہ ایک ماہانہ مجلّہ "اردو نامہ" کا اجراء تھا جس کا موسس اور پہلا چیف ایڈیٹر ہونے کا اعزاز مجھے حاصل ہوا اس کے پہلے ایڈیٹر کے طور پر میری نظر شعیب بن عزیز پر پڑی جو اس وقت لاہور ہی میں محکمہ تعلقات عامہ میں تعنیات تھے اور میں ان کی ادبی اور صحافتی صلاحیتوں سے اس وقت سے واقف تھا جب انہوں نے محکمہ اطلاعات راولپنڈی میں میری تقرری کے دوران ملازمت کا آغاز کیا تھا شعیب جو ایک اچھے نوجوان شاعر بھی ہیں محکمہ تعلقات عامہ میں اپنی ترقی ہونے پر واپس چلے گئے اور ان کے بعد پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ منتخب ہو کر عطش درانی آئے انہوں نے اپنی محنت اور قابلیت سے "اردو نامہ" کو مزید مقبول بنایا آج کل عطش درانی مقتدرہ قومی زبان سے وابستہ ہیں اور پی ایچ ڈی کرنے کے بعد اپنے نام کے ساتھ "ڈاکٹر" کا اضافہ کر چکے ہیں-

وفاقی محتسب کا ادارہ

۱۹۸۳ء میں لندن سے میرے دوست سلیم قریشی صاحب پاکستان آئے اور لاہور میں میرے پاس قیام کیا اگلے روز ہی صبح جب میں دفتر جانے کی تیاری میں مصروف تھا قریشی صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ مجھے دفتر جاتے ہوئے جسٹس سردار محمد اقبال صاحب کی رہائش گاہ پر چھوڑتے جائیں۔ سردار صاحب سے اس سے پہلے میرا کوئی ذاتی تعارف نہ تھا۔ البتہ ایک جج اور ماہر قانون کی حیثیت سے انہیں کون نہیں جانتا تھا اس کے علاوہ تھوڑا عرصہ پہلے ہی اخبارات میں خبریں چھپی تھیں کہ صدر مملکت نے انہیں پاکستان کا پہلا محتسب نامزد کیا ہے اس سے قبل پاکستان اس قسم کے ادارے سے نا آشنا تھا اس لئے سردار صاحب کے لیے ملک میں ایک موثر احتسابی نظام قائم کرنا واقعی ایک بہت بڑا چیلنج تھا اور ان کا اس منفرد اور اعلیٰ منصب کے لیے انتخاب ان کی صلاحیتوں کے بالواسطہ اعتراف کے مترادف تھا میں جب قریشی صاحب کو لے کر ان کی رہائش گاہ واقع ظفر علی روڈ پر پہنچا تو قریشی صاحب نے مجھ سے کہا کہ آیئے میں آپ کا تعارف بھی کرادوں۔ چنانچہ میں چند منٹ کے لیے قریشی صاحب کے ساتھ اندر چلا گیا۔ سردار صاحب اپنے بیڈروم میں تھے اور بخار کی حالت میں لیکن انہوں نے اپنے مہمانوں کا استقبال نہایت گرم جوشی اور خندہ پیشانی سے کیا میں ان کے اس انداز سے بہت متاثر ہوا تھوڑی ہی دیر بعد چائے آگئی اور سردار صاحب کی بیگم صاحبہ نے از خود ہماری تواضع چائے اور دوسری چیزوں سے کی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ گھرانہ اپنی امارت اور مرتبہ و شہرت کے اوصاف کے باوجود اس دور میں بیک وقت اعلیٰ ترین مشرقی روایات کا بھی حامل ہے۔ مختصر سی گفتگو کے بعد میں اجازت لینا چاہتا تھا لیکن سردار صاحب مجھ سے مسلسل ہم کلام رہے اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی نشست میں اکثر اہم موضوعات پر مجھ سے تبادلہ خیال کیا مجھ پر خصوصی توجہ کا غالباً ایک سبب یہ بھی تھا کہ سلیم قریشی صاحب از راہ محبت مجھ سے ہمیشہ حسن ظن رکھتے ہیں اور میری تعریف و توصیف کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے
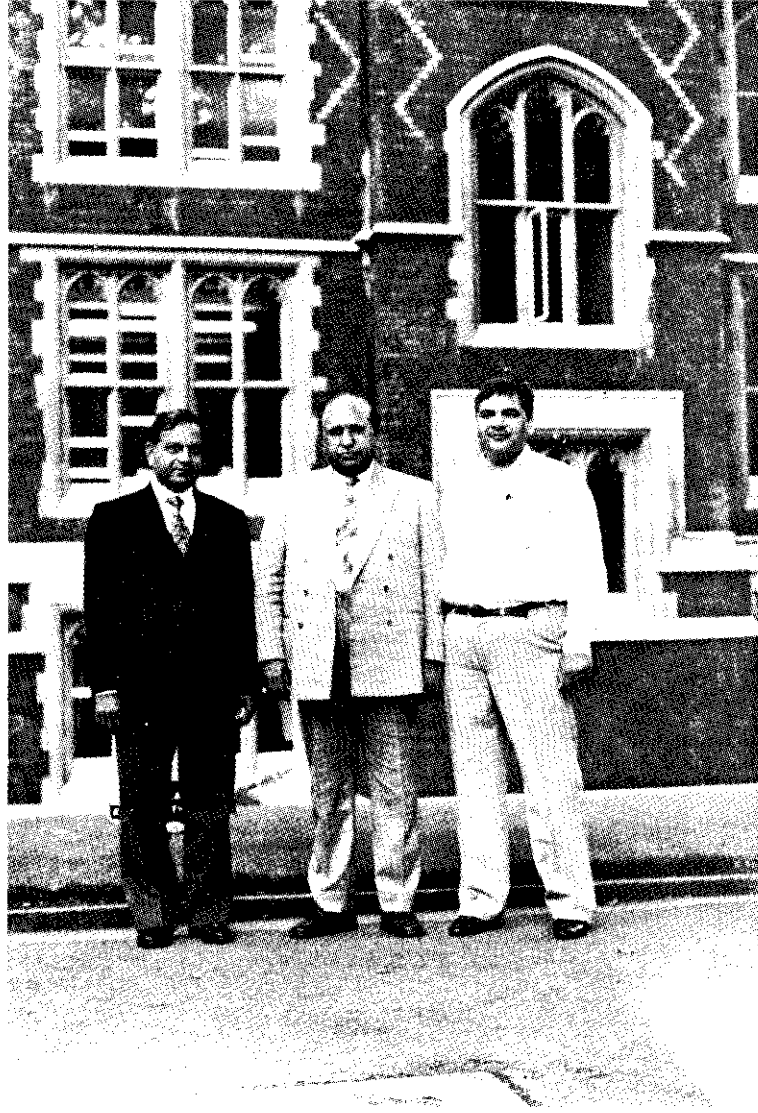
لنکنز ان لندن میں بیرسٹر سلیم قریشی (بائیں) اور محمد اسلم (دائیں) کے ساتھ (۱۹۹۲)

حقیقت میں یہ ان کا انتھائی خلوص ہے جو آج بھی روز اول کی طرح قائم ہے ورنہ

من آنم کہ من دانم

بات آئی گئی ہوئی کہ تھوڑے ہی دن بعد میں نے عید کے روز جب سردار صاحب کو "عید مبارک" کہنے کے لیے ٹیلیفون کیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے وفاقی محتسب کے دارے کے لیے حکومت سے میری خدمات مانگ لی ہیں میں ان کی اس شفقت پر سخت حیران تھا۔ لیکن جب ان کے ساتھ تقریباً" چار سال اسلام آباد میں کام کیا تو کھلا کہ اللہ تعالٰی نے سردار صاحب میں اپنا گرویدہ بنانے کی صلاحیتیں منجملہ دوسری خوبیوں کے پوری فیاضی کے ساتھ ارزانی فرمائی ہیں غالباً" یہی وجہ تھی کہ محتسب کا ادارہ پاکستان میں نہ صرف جڑیں پکڑ گیا بلکہ ان کی خداداد صلاحیتوں اور کاوشوں کے نتیجہ میں پھلنے پھولنے لگا۔ لوگوں کو انتظامیہ کے ہاتھوں زیادتی کے خلاف انصاف ملنے کا یقین تھوڑے ہی عرصہ میں ادارہ کی کارکردگی کو دیکھ کر ہو گیا۔ سردار صاحب نے اس ادارہ کے لیے تمام افسروں کا انتخاب خود کیا اور حکومت سے جسے مانگا حکومت انکار نہ کر سکی ایک نہایت غیر معمولی بات جو میں نے اپنی تمام سرکاری ملازمت کے دوران محسوس کی وہ یہ تھی کہ سردار اقبال صاحب کی قیادت میں میں نے ہی نہیں بلکہ ان کے منتخب کردہ ہر افسر نے نہایت جاں فشانی اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اتنا کام کیا کہ ہم لوگ خود بھی کبھی اس کا تصور نہیں کر سکتے تھے یہ بات بظاہر مبالغہ معلوم ہوتی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ ایک عرصہ تک میں دن میں صرف ایک بار سورج کی شکل دیکھ سکتا تھا اور وہ اس وقت جب صبح آٹھ بجے دفتر جاتا تھا کیونکہ واپسی پر رات ہو جاتی تھی اور میں گاڑی کی لائیٹس جلا کر گھر آتا تھا ویسے بھی دوڈہائی سال دفتر میں میرا کمرہ اس سمت میں رہا جہاں دھوپ کا بھی گذر نہیں ہوتا تھا۔

سوال یہ ہے کہ آخر ہم سب اس قدر کام کرنے پر کیوں مجبور ہو گئے تھے اول تو پہلا سبب یہ تھا کہ سردار صاحب ہم افسران میں سے ہر ایک سے زیادہ کام خود

کرتے تھے اور تھکتے نہیں تھے وہ تمام دن میں چند بار صرف بسکٹوں کے ساتھ چائے پیتے تھے جب کہ دوسرے لوگ دفتر ہی میں اس کے علاوہ بھی کچھ کھا پی لیتے تھے دوسرے یہ کہ سردار صاحب نے اپنی شخصیت کے علاوہ اپنی شفقت و محبت سے ہر ایک کو ایسا پابند سلاسل کیا ہوا تھا کہ کسی میں کام سے گریز کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی ایک ایک شخص کے ذاتی معاملات میں وہ دلچسپی لیتے تھے اور مسائل کے حل میں مدد دیتے تھے۔ میرے بچوں کے داخلے کے سلسلہ میں جب دشواری پیش آئی تو انہوں نے اسے اپنا ذاتی معاملہ سمجھا اسی طرح ایک دن میرے کمرہ میں آئے اور مجھے دیکھ کر پوچھا کہ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں کیا بات ہے میں نے بتانے سے گریز کیا لیکن وہ اصرار کرنے لگے تو میں نے بتایا کہ میری اہلیہ کے لیے اپریشن تجویز کیا گیا ہے سنتے ہی میرا ہاتھ پکڑا اور اوپر اپنے کمرے میں لے گئے خود لیڈی ڈاکٹر عظیمہ کو پولی کلینک میں ٹیلیفون کیا تمام انتظامات مکمل کرا دیئے اور مجھ سے کہا کہ اب آپ دفتر کو بھول جایئے اور اپنی بیگم کی خدمت میں حاضر رہئے یہی نہیں بلکہ کئی بار وہ خود ہسپتال تشریف لائے اور جب میری اہلیہ صحت یاب ہو کر واپس گھر آگئیں تو وہ خود اور مسز اقبال ہمارے گھر ایک دفعہ سے زیادہ مزاج پرسی کے لیے آئے۔ لہٰذا جہاں ایسی شفیق ہستی افسر کے روپ میں سامنے ہو تو کون کافر ہو گا کہ فرائض منصبی کو بہترین طور پر ادا کرنے میں سردھڑ کی بازی نہ لگا دے ورنہ سرکاری ملازمتوں میں اکثر جس قسم کے افسران سے سابقہ پڑتا ہے اس کا اظہار پنڈت تلوک چند محروم نے محکمہ تعلیم کی پینتیس سال کی ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد ان الفاظ میں کیا تھا۔

سی و پنج سال عمرم بہ ملازمت بسر شد
سحر شباب خود راہمہ تیرہ شام کردم
شرفم بہ عہد پیری چہ بود کہ در جوانی
بہ سگاں ادب نمودم بہ خراں سلام کردم

میں کوتاہی کا مرتکب ہونگا اگر اس قیمتی تجربہ کا ذکر نہ کروں جو جناب جسٹس شفیع

میجر جنرل (ریٹائرڈ) سید شاہد حامد سابق وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات و صدر علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن سے سرسید کالج کے سالانہ ڈنراور مشاعرہ کے موقع پر شیلڈ وصول کرتے ہوئے (۱۹۹۲)

الرحمن صاحب کی سربراہی میں دوبار وفاقی محتسب ہی کے ادارے میں مجھے میسر آیا ایک بار وہ سردار اقبال صاحب کی ملک سے مختصر غیر حاضری کے دوران قائمقام محتسب رہے اور دوسری بار جب سردار صاحب ریٹائر ہوئے تو اسی حیثیت میں انہوں نے کل وقتی محتسب مقرر ہونے تک اپنے فرائض انجام دیئے مجھے جناب شفیع الرحمن سے ایک عرصے سے تعارف اور نیاز مندانہ مراسم کا شرف حاصل تھا لیکن ان کی ذہانت قابلیت اور برق رفتار کارکردگی دیکھنے کا زیادہ قریب سے پہلی بار موقع ملا ان کے پاس افسران کے مرتبہ مسودات جاتے تو بہت کم ایسا ہوتا کہ بالمشافہ گفتگو کی ضرورت پیش آتی یا تو وہ کسی بھی وضاحت طلب نکتہ پر افسر متعلقہ سے ٹیلیفون ہی پر رجوع کر لیتے یا مسودہ میں معمولی سا ردو بدل کر کے ایسی خوبصورت اصلاح کرتے کہ غلطی کرنے والا دل سے معترف ہو جاتا۔ یہی نہیں ان کی باریک بینی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی تاریخ یا اعداد و شمار تک میں ٹائپ کی کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو اس کی نشان دہی کر دیتے۔ حالانکہ افسران میں یہ رجحاناں عام پایا جاتا ہے کہ اعداد و شمار وغیرہ کی تصحیح کا کام وہ ٹائپ کرنے والے پر چھوڑ دیتے ہیں۔ کام کی بے پناہی کے باوجود شفیع الرحمٰن صاحب ٹھیک چار بجے اپنا تمام کام نمٹا لیتے اور دفتر سے اٹھ جاتے حالانکہ صبح کے وقت وہ سپریم کورٹ میں بھی بیٹھتے تھے۔ لیکن میرے نزدیک اس صورت حال کے پس منظر میں سردار اقبال صاحب کی کاوشیں بھی کار فرما ہیں جنہوں نے دن رات کام کر کے اس ادارہ کو ایک ایسا نظام کار اور ایسے دفتری طریقے عطا کیے کہ آئندہ کام کی کسی بھی زیادتی سے نمٹنے کے لیے موثر امکانات میسر آگئے۔

وفاقی محتسب کی رپورٹ

میں جب ۲۷ مارچ ۱۹۸۸ء کو واپس آکر اپنے محکمے نیشنل سیونگز کا ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے سربراہ مقرر ہوا تو وفاقی محتسب کی وہ رپورٹ میرے ساتھ آئی جو سردار اقبال صاحب نے مجھ ہی سے مرتب کرائی تھی اور جس میں محکمے کے تمام معاملات و مسائل کا احاطہ کیا گیا تھا اور اصلاح احوال کے لیے موثر اقدامات تجویز کیے

گئے تھے جن میں سب سے اہم محکمے کو بنکنگ کے فرائض انجام دینے کے لیے ضروری خود اختیاری' نام کی تبدیلی' ملازمین کے حالات کار بہتر بنانے اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے تجاویز نیز کمپوٹر کے نظام کو متعارف کرانے کے ساتھ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کو بچت کی سکیموں میں سرمایہ کاری کرنے کے لیے ضروری سہولتوں کی فراہمی شامل تھی۔ سن ۸۸ء سے سن ۹۴ء آگیا ہے چھ سال گذر جانے کے بعد بھی سرخ فیتے کے ہاتھوں محتسب کی اس رپورٹ پر عمل درآمد کی نوبت نہیں آئی جس کی نقول صدر مملکت' وزیر اعظم اور پارلیمنٹ کے اراکین کو ارسال کی گئی تھیں۔ اس وقت میرا موضوع سخن چونکہ دفتری معاملات نہیں اس لیے صرف ایک ہی نکتہ کی مزید نشاندہی کرنا چاہوں گا کہ کاش بچتوں سے حاصل شدہ رقوم بجٹ کا حصہ بننے کے بجائے سرمایہ کاری کے لیے استعمال کی جائیں کہ دنیا بھر کے ممالک میں یہی طریقہ رائج ہے جو احسن بھی ہے اور منافع بخش بھی۔

تعارف یا سوانح

میں نے برسوں پہلے اس تحریر کا آغاز کیا تھا پھر درمیانی وقفے میری سرکاری مصروفیات کی نذر ہو گئے۔ اتنی یکسوئی میسر نہ آسکی کہ یہ کام مکمل کرتا۔ ویسے بھی ارادہ صرف ایک مختصر تعارف لکھنے اور ان حضرات کا شکریہ ادا کرنے کا تھا جنھوں نے مجھے اور میری نظم و نثر کی تحریروں اور ماضی میں بکھری ہوئی میری ادبی' ثقافتی اور علمی سرگرمیوں کو موضوع فکر بنایا تھا لیکن

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اور بات سے بات نکلتی ہی رہی حتی کہ میرے ماضی کی ایک داستان آپ نے میری زبانی سن لی۔ آپ چاہیں تو اسے میری سوانح سمجھ لیجے یا میری ماضی کی زندگی کا ایک عکس بہرحال

بہ حرفے میتواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را

اسلام آباد

مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۹۴ء

اسلام آباد میں مصنف کی رہائش گاہ پر جناب جاوید قریشی کے اعزاز میں منعقدہ ایک شعری نشست کے شرکاء (دائیں سے) فہیم گردیزی۔ ضیغم محمود رضوی۔ شفیق احمد۔ پرتو روہیلہ۔ ابن الحسن۔ افتخار عارف۔ ڈاکٹر معزالدین۔ ڈاکٹر توصیف تبسم۔ صادق نسیم۔ جاوید قریشی۔ ناصر زیدی منصور عاقل (میزبان) ضیاء جالندھری اور رحمت اللہ خاں (۱۹۹۳ء)

حصہ دوئم

حدیث دیگراں

حجاب جتنے تھے سارے اٹھا گیا کوئی
مجھی سے میرا تعارف کرا گیا کوئی

---------منصور عاقل

پروفیسر ڈاکٹر خیال امروہوی

منصور عاقل کا گہوارۂ سخن

منصور عاقل نے اپنی شاعری میں سلاست و روانی و پرکاری کے ساتھ ساتھ الفاظ و اصطلاحات کو نئے مفاہیم دیئے ہیں۔

تین دہائی پیشتر کی بات ہے جب منصور عاقل نوجوان اور ہم جوان تھے۔ لاہور کی موسمی مہک اور ہم سفیران ادب کی چہک میں نہ شب کا علم ہوتا نہ سحر کی خبر۔ لاہور واقعی شاہوں اور شہزادوں کا شہر تھا۔ نہ شور نہ ہنگامہ، ہر لمحہ کتاب کا ذکر اور تذکرہ خامہ۔ منصور شیروانی پہنتے تھے۔ نستعلیق، لئیق اور عمیق آدمی تھے۔ پھر یہ میانوالی کالج میں علم وادب کے چراغ جلانے چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد محکمہ تعلقات عامہ میں آگئے میر عبدالصمد خاں کا دور تھا۔ میر صاحب بڑے تحقیقی آدمی تھے ان کے کمرے میں ہر وقت اہل کمال کا جمگھٹا رہتا۔ انہیں دنوں منصور عاقل کے بڑے بھائی علامہ قابل گلاوٹھوی سے بھی شرف نیاز رہا۔ ایک روڈ پر حضرت احسان دانش کے کلبہ علم ودانش میں ملاقات رہتی تھی۔ زیبا ناروی، نقش ہاشمی، عاطر ہاشمی، قمر صدیقی اور نہ جانے کون کون اسی عہد کی یادگار ہیں۔ منصور عاقل کی شخصیت اور شاعری اس دور میں بھی افق فکر پر قوس قزح کی طرح رنگ بکھیرتی تھی۔ پھر ہوا یہ کہ لمحات گریزاں اور فواصل افتاں وخیزاں نے ہم سب کو جدا کردیا۔ میں ڈاکٹریٹ کے لیے

ایران چلا گیا۔ منصور عاقل سرکاری عہدوں کی رفعتوں کی جانب مائل پرواز ہو گئے۔ ۱۹۸۰ء میں گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج لیہ کے پرنسپل جناب سید جعفر عباس زیدی نے بتایا کہ "اردو نامہ" لاہور کے اڈیٹر منصور عاقل ہیں۔ ذہن میں ماضی کے لمحات رقصاں ہو گئے۔ پروفیسر جعفر عباس زیدی کو اگر اس دور کا آرنلڈ کہا جائے تو مناسب ہے۔ دیکھنے اور سننے کی چیز ہیں۔ علوم کے خلاصے ان کے ہر لفظ سے مترشح ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے نابغوں کی سٹی گم ہوجاتی ہے۔ اکتوبر ۱۹۹۴ء میں خاکسار کو ایک بار پھر منصور عاقل کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ دوران گفتگو معلوم ہوا کہ موصوف کا تازہ مجموعہ کلام "گہوارہ سخن" زیراشاعت ہے اور یہ کہ منصور صاحب اپنے بڑے بھائی علامہ قابل گلاؤٹھوی کا غیر مطبوعہ کلام بھی مدون کر رہے ہیں۔ پھر مستزاد یہ کہ علم بلاغت کی روشنی میں قابل صاحب کے محاسن کلام کو بھی پیش کریں گے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دن بھی نکل آیا جب "ڈاکیے" نے گہوارہ سخن کا رجسٹرڈ پیکٹ تھما دیا۔ منصور صاحب نے لکھا تھا "برائے انتقاد و تبصرہ"

شاعری کو تمام فنون لطیفہ پر فوقیت حاصل ہے۔ فوقیت یوں کہ ہر فن لطیف شاعری کی طرح لامحدود نہیں۔ مصوری، مجسمہ طرازی، موسیقی موضوع اور حقیقت کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن نہ مصوری میں موسیقی شامل ہوسکتی ہے نہ موسیقی یا مصوری میں مجسمہ سازی داخل ہوسکتی ہے۔ ہرچند تجسیم کے کئی زاویے بھی ان فنون میں ملتے ہیں۔ لیکن ان کے برعکس شاعری میں مصوری بھی ہے موسیقی اور مجسمہ سازی بھی۔ احساسات وجذبات بیک وقت لفظوں کے دروبست کی وساطت سے تمام فنون لطیفہ کی نمائندگی کرسکتے ہیں۔ شعر کو سنکر "واہ اور آہ" کا عمل انہیں مذکورہ فنون کی سحرانگریز کیفیات کا نام ہے۔

شاعر کے لفظی معنی صاحب شعور کے ہیں۔ شاعر جس سماج سے تعلق رکھتا ہے اس سے متاثر ہوتا ہے۔ شاعر کو مخصوص نقطہ نظر کی زنجیر سے پابند نہیں کیا جاسکتا شاعر کا ایک تہذیبی پس منظر بھی ہوتا ہے۔ اس کی داخلی اور خارجی شخصیت کا عمل دخل بھی ہوتا ہے۔ ذاتی کیفیات خواہ رومانی ہوں یا واقعاتی، تاریخی ہوں یا معاملاتی، یہ سب عوامل اس کی شاعری میں موجود ہوتے ہیں اور انہیں عوامل کی وساطت سے شاعر

کے مزاج اور اسکی شخصیت کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

منصور عاقل کا سخن اور اسکا گہوارہ ایک ایسی تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں جواب موجود نہیں اور اگر ہیں تو بھی ان کا ذیلی تعلق عصری تقاضوں کا ہمرنگ بھی ہوگیا ہے جہاں تک روایت کا تعلق ہے وہ ہر شعبہ علم وفکر سے مربوط ہے۔ ادب ہو یا سائنس' فلسفہ ہویا عمرانیات "روایت" کی وضاحت کے بغیر شناخت نہیں کیے جاسکتے۔

زبان وبیان کی بھی ایک روایت ہے۔ مثلاً ہم منصور عاقل کی شاعری کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک میرو غالب' حالی واقبال' حسرت یا فیض کو نہ سمجھ لیں۔ غزل میں ماضی پرستی کوئی عیب نہیں۔ البتہ عیب یہ ہوگا کہ معروضی تقاضوں سے صرف نظر کیا جائے۔ جمال پسندی شاعرانہ مزاج کا حصہ ہے رومان خواہ کائناتی ہو یا انسانی اپنی اپنی حیثیت سے فنون لطیفہ کا جزو ہیں۔ شاعر کو جمال پسندی سے الگ رکھتے ہوئے کھردری تنقید کا نشانہ بنا دینا فی نفسہ غیر ادبی عمل ہے۔ اگر منصور عاقل انسانی واقعات وحوادث کو بھی جمالیاتی انداز سے بیان کرنا پسند کرتے ہیں تو چشم ماروشن دل ماشاد۔ کیونکہ رومانیت بھی انسانی زندگی کا حصہ ہے۔ کائناتی تغیر اور اسکے نتیجے میں انسانی ذہن پر پیدا ہونے والے اثرات سے کون انکار کرسکتا ہے۔ مثلاً اگر میں نے کسی سے محبت نہیں کی یا کسی نے مجھے اس لائق نہ سمجھا کہ پیار کیا جائے تو محبت کے جذبے سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے۔

مے نوشی لاکھ حرام سہی لیکن شراب تو بہرحال بنتی ہے۔ بنائی جاسکتی ہے۔ اسکا کیف بھی ہے۔ اچھے اثرات بھی ہیں اور برے بھی۔

اردو اور فارسی شاعری میں ایک عیب یہ بھی رہا ہے کہ برصغیر میں ایرانی زبان وثقافت نے اردو میں کچھ ایسے الفاظ واصطلاحات بھر دیئے ہیں۔ جن کا ذکر کیے بغیر شاعری میں غنائیت پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔ تلمیحات کا بھی انبار ہے۔ اس تناظر میں جب اردو شاعری کا جائزہ لیں تو اکثر شعراء نے جن میں فیض سرفہرست ہیں۔ روایتی ڈکشن پر ضرب کاری لگائی۔ اور سابقہ الفاظ واصطلاحات کو بدلتی دنیا کے مطالبات کا ہم آہنگ بنانیکی کوشش کی ہے۔ مثلاً اب ساغر ومینا' زنجیر وسلاسل' گل وبلبل' عشوہ' ناز وادا' شمع وپروانہ کے وہ معنی نہیں رہ گئے جو کلاسیکی شاعری میں متعین کیئے گئے تھے۔

منصور عاقل نے بھی اپنی شاعری میں سلاست وروانی' سادگی وپر کاری کے ساتھ ساتھ الفاظ واصطلاحات کو نئے مفاہیم دیئے ہیں۔ ان کا انداز بیان اگرچہ کلاسیکی ہے لیکن ان کی شاعری کی "موضوعیت" جدید ہے۔ وہ ماضی کے حوالے سے آج کی بات کرنے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں۔

سر مقتل جو اے ہمدم پریشاں روزگار آئے
وفا کا آخری یہ بوجھ بھی سر سے اتار آئے

ظلمت نصیب چاند ستاروں کو دیکھ کر
انجام آفتاب سحر دیکھتے رہے
کاٹی گئی زباں تو کہیں سر قلم ہوئے
کیاکیا مال عرض ہنر دیکھتے رہے

منصور عاقل کے "گہوارۂ سخن" کی شاعری کی خوبی یہ ہے کہ "تغزل" قاری کو بور نہیں کرتا بلکہ اس کی تشنگی قائم رہتی ہے۔ اس اعتبار سے منصور صاحب غزل کے شاعر ہیں۔ غزل جہاں بحر بیکراں کی حیثیت رکھتی ہے وہاں نزاکت' لطافت اور ندرت جیسی شعری خصوصیات کی بھی حامل ہے۔ آج جبکہ مختلف فلسفوں اور نظریوں نے غزل کو نظم نما بنادیا ہے۔ غزل کے حسن کو قائم رکھنا دشوار گزار مرحلہ ہوگیا ہے یوں تو دنیا میں طلب ورسد کا عمل ہمیشہ سے جاری ہے اور رہے گا لیکن ادب میں عوامی طلب کے مقابلے میں "سپلائی" کو سوقیانہ نہیں ہونا چاہیے۔ غزل ہمیشہ جاندار صنف سخن رہی ہے اسکی طلب بھی قائم ہے لیکن طلب کے مقابلے میں یار لوگوں نے غزل کو تغلت کے جوہڑ میں پھینک کر کچھ اچھی خدمت سرانجام نہیں دی یہ بات میں اپنے سلسلے میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ فقیرنے بھی "غزل" میں قابل ذکر کارنامہ

سرانجام نہیں دیا یا یوں کہہ لیجئے غم دوراں کے تناسب سے غم جاناں نصیب نہ ہوسکا۔ منصور عاقل کو غم جاناں اور غم دوراں دونوں نصیب ہوئے اور انہوں نے اپنے علم، مشاہدے، اور اطمینان بخش ملازمت کی بنیاد پر غزل کے "محاسن" قائم رکھنے میں نمایاں کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ "گہوارۂ سخن" کے مطالعے کے دوران مجھے جو اشعار بے حد پسند آئے درج ذیل ہیں۔

گلوں کے رنگ اڑے ہیں یہ کس کی آمد سے
یہ کس نے قافلہ نوبہار لوٹ لیا

عشق خود اپنی تباہی پہ پشیماں نکلا
جو بھی غم تھا وہ غم گردش دوراں نکلا
کھینچ لایا ترے عشاق کو پھر برسردار
دل گرفتار تنک ظرفی عرفاں نکلا

مٹا کے دیر وحرم کے تخیلات دوئی
بس اک تصور بے صبح وشام پیدا کر

یہی طلب تھی کہ جس سے چراغ طور جلا
یہیں سے شام بلا کا ظہور ہوتا ہے

کہیں چھپائے سے چھپتی ہیں وحشتیں دل کی
خرد نے سی بھی دیئے پیرہن تو کیا ہوگا

فن شاعری تجرباتی سائنس یا علم ریاضی نہیں جنہیں خود ساختہ اصولوں یا من پسند پیانوں سے ناپا تولا جاسکے۔ کوئی بھی فنکار کبھی مکمل صورت میں سامنے نہیں لایا جاسکتا۔ اگر ایسا تصور کر لیا جائے تو گویا فن کو قتل کردینے کے مترادف ہوگا۔ "گہوارہ سخن" میں بھی بعض موضوعات توجہ طلب لہجوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ جن موضوعات کو منصور صاحب نے کمال چابکدستی سے فن کی گرفت میں لے لیا ہے وہ یقیناً "گہوارہ سخن" مجموعہ کلام کا حاصل ہیں۔ بلکہ اکثر اشعار اپنی موضوعی وسعت، شدت احساس، فن کارانہ مہارت کی تصویریں دکھائی دے رہے ہیں۔

☆ ڈاکٹر محمد معزالدین

گہوارۂ سخن

منصور عاقل کے یہاں الفاظ و تراکیب اور بندشیں کلاسیکی سی مگر خیال میں ندرت اور شعر میں نزاکت جلوہ ریز ہے ان کی شاعری کا بنیادی عنصر اس کی غنائیت اور موسیقیت ہے۔

نہ جانے کب سے جنون محو خواب تھا عاقل
غزل سرا مرے گہوارہ سخن سے اٹھا

آتش قلب سے بھڑکے ہیں جو شعلے عاقل
برق بن کر مرے اشعار تک آپہنچے ہیں

ان اشعار کے خالق سید منصور عاقل ہیں جن کا شعری مجموعہ "گہوارۂ سخن" کے نام سے چند دن پہلے شائع ہو کر شائقین ادب کے ذوق نظر کی تسکین کا سبب بنا ہے۔ اس تازہ ترین کتاب کے کل دو سو بانوے صفحات ہیں۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ایک سو اٹھائیس غزلیں ہیں جو ان کے تقریباً نصف صدی کے ریاض کا انتخاب ہیں۔ دوسرے حصے میں "متفرقات" کے عنوان سے بتیس نظمیں

☆ سابق صدر نشیں شعبہ اقبالیات کیمبرج یونیورسٹی (انگلینڈ) سابق ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی لاہور و سکریٹری قومی ہجرہ کونسل اسلام آباد

حمد، نعت، سلام کے علاوہ مختلف موضوعات کے تحت لکھی گئی ہیں۔ غزلیں تاریخی ترتیب سے پیش کی گئی ہیں اور التزام یہ رکھا ہے کہ جدید غزلوں کو پہلے اور قدیم کو بعد میں شامل کتاب کیا ہے۔ جن سے ان کے ذہن وفکر کی ترقی کا قاری کو آسانی سے اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس کتاب کا انتساب اپنی رفیقہ حیات سیدہ ناہید منصور کے نام سے ہے۔ ناہید کے نام ان کی ایک دلکش نظم بھی شامل کتاب ہے۔

گہوارۂ سخن کا پیش لفظ پاکستان کے ممتاز شاعر، نقاد اور دانشور جناب شان الحق حقی نے لکھا ہے جس میں غزل کی روایت، اس کی مقبولیت اور تازہ کاری پر نہایت عالمانہ بحث کی ہے۔ "میری شاعری" کے عنوان سے منصور عاقل نے اپنا نظریہ شعر گوئی۔ غزل کے فنی تقاضے شعری ادراک، وہبی اور اکتسابی عمل، غم جاناں سے غم دوراں کے تمام سلسلے پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ جس سے ان کے نقطہ نظر اور ان کے کمال فن کو پرکھنے میں مدد ملتی ہے۔ منصور عاقل کو شاعری ورثے میں ملی ہے۔ ان کے نانا عبدالوحید گلاوٹھوی متخلص فدا کا شمار داغ دہلوی کے نورتنوں میں ہوتا تھا۔ یہ اپنے زمانے کے باکمال شاعر تھے۔ "برگ سبز" کے نام سے ان کے کلام کا کچھ حصہ منصور عاقل نے ترتیب دے کر چھپوایا ہے ان کی والدہ مرحومہ بھی اچھا شعری ذوق رکھتی تھیں۔ ان کے بڑے بھائی قابل گلاوٹھوی مرحوم کا شمار بھی اساتذہ فن میں ہوتا تھا۔ فی البدیہہ اشعار میں ان کا جواب نہ تھا۔ غرضیکہ شعروشاعری منصور عاقل کی گھٹی میں پڑی ہے۔

"حرف بہ حرف" کے عنوان سے منصور عاقل کے مضامین کا مجموعہ آج سے تقریباً" دس سال پہلے منظر عام پر آیا۔ اس میں بھی تخلیق شعر، اس کی وجدانی کیفیت، انسانی جذبات، احساسات اور معاملات، انجذاب واکتسابات پر بصیرت افروز خیال آرائی کی ہے یہ مضامین ان کے فکر وفن کی عکاسی کرتے ہیں۔ جملہ اصناف سخن میں غزل کو جو اہمیت، شہرت اور مقبولیت حاصل رہی ہے اس سے کسی کو انکار نہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے سچ کہا ہے کہ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ غالب نے ہر چند یہ شعر کہا کہ

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

مگر آج شہنشاہ غزل ہی کی حیثیت سے ان کے نام کو شہرت دوام حاصل ہے۔ مولانا حالی نے مقدمہ شعروشاعری میں غزل کو نامطبوع صنف سخن قرار دیا مگر

اب بھاگتے ہیں سایہ زلف بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

جیسا شعر کہنے والا غزل سے کہاں اپنا دامن چھڑا سکا۔

بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

کلیم الدین احمد نے اردو غزل کو نیم وحشیانہ صنف شاعری کہا مگر اس کے باوجود غزل اپنی اندورنی اور خارجی کیفیات کے بیان' موضوعات کی وسعت' اعجاز رمزیت' ایمائیت' حسن تغزل اور رعنائی اسلوب کے سبب آج بھی دیگر اصناف پر بھاری ہے۔ بلکہ اس کی مقبولیت فی زمانہ بڑھتی جارہی ہے۔ کیونکہ اس کے اختصار ہی میں اسکی جامعیت کا راز ہے منصور عاقل نے نہایت کامیاب نظمیں بھی کہی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ غزل ہی منصور عاقل کی طبع رسا کی اصل جولا نگاہ ہے اور ان کی نظموں میں بھی تغزل کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔

ان کے نزدیک یہ فیضان قدرت بھی ہے اور اکتسابی عمل کا ماحصل بھی۔ مشق ومزاولت تجربے اور مطالعے سے یہ خوب سے خوب تر بنتی ہے۔ داخلی تجربات اور خارجی محرکات دونوں کے امتزاج سے اس کے حسن وشباب میں نکھار پیدا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ منصور عاقل کے یہاں کلاسیکی رنگ تغزل کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے میلانات' عصری تقاضے اور آئینہ ایام میں عکس بند تصویروں کی جھلک ملتی ہے۔

ان کے یہاں مضامین میں انفرادیت بھی ہے اور تنوع بھی

دیوانے ہیں کہ جن کو ہے دیوانگی پسند
ہم کو نہیں بہار میں آشفتگی پسند

وہ بولا تھا تو کچھ شعلے سے لپکے تھے مری جانب
ہوا خاموش تو اس بت کا سحر گفتگو ٹوٹا

ان کے اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزل کے اجزائے ترکیبی اور ہیت کا انہوں نے بالالتزام مطالعہ کیا ہے اور اپنے اشعار میں اسے فاضلانہ طور پر برتا ہے۔ اپنی سرکاری ذمہ داریوں اور فرائض منصبی کی بحسن وخوبی انجام دہی کے ساتھ چمنستان شعروادب کی آبیاری کرتے رہے ہیں۔ ادنی تصرف کے ساتھ حسرت کے اس شعر کا ان پر پورا اطلاق ہوتا ہے کہ

ہے مشق سخن جاری "دفتر" کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے "عاقل" کی طبیعت بھی

غزل ہی منصور عاقل کی پہلی محبت ہے یہ خود کہتے ہیں کہ "غزل میں جذباتی، فکری اور معنوی آفاقیت کو سمولینے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے"۔ ان کے اس قول اور مذکورہ نظریہ شعر کی روشنی میں جب ہم ان کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ شعری روایات اور غزل کے مروجہ الفاظ اور معنویت کو برقرار رکھتے ہوئے انہوں نے غزل کے اصلی روپ یعنی تغزل کو اس کا سرمایہ افتخار گردانا ہے اور اسکے مزاج کو زمانے کی روش سے آشنا رکھتے ہوئے اس میں نئی پیوندکاری سے

فکر تازہ کو برگ وبار بخشتا ہے۔

شوق کو کب تھا میسر کہ جو اب ہے موسم
گل ہے پیمانہ بہ کف شیشہ بہ لب ہے موسم
مے کے بادل سے چلے آتے ہیں میخانے سے
کیا قیامت ہے یہ رت کیسا غضب ہے موسم
لب تک آتے ہی گرا ہاتھ سے جام مے ناب
میرے اللہ یہ کب تھا کہ جو اب ہے موسم

جب سے لائی ہے صبا پیرہن ناز کی بو
نکہت گل بھی پریشاں ہے مرے آنگن میں
کس کو لے آیا ہے پھر میری وفاؤں کا خیال
کون شرمندہ احساں ہے مرے آنگن میں

یہ اس کی خاص عنایت کہ اس نے قدر تو کی
میں جانتا ہوں کہ آنسو مرا گہر تو نہ تھا

منصور عاقل کے یہاں الفاظ و تراکیب اور بندشیں کلاسیکی سہی مگر خیال میں ندرت اور شعر میں نزاکت جلوہ ریز ہے۔ ان کی غزل کا بنیادی عنصر اس کی غنائیت اور موسیقیت ہے۔ غزل موضوعات کے قیدوبند سے آزاد ہے مگر طرز بیاں' اظہار خیال اور انداز واسلوب اس کو حسن وجلا عطا کرتے ہیں۔

منافقت کی بھی ہوتی ہے کوئی حد یارو
زباں نہ دل کی طرف ہے نہ دل زباں کی طرف

منصور عاقل کی طبیعت میں مخصوص سادگی کے ساتھ ایک طرح کی ظرافت و بذلہ سنجی بھی پائی جاتی ہے جو ایک طرف ان کے حسن طبیعت کی آئینہ دار ہے تو دوسری طرف ان کی طبع کی براقی کی۔ کیونکہ بذلہ سنجی کے لیے ذہانت شرط اول ہے۔

اسی سبب سے جھکی ہے کمر ضعیفوں کی
تمام عمر کا یہ بوجھ ہیں اٹھائے ہوئے
ہماری سادہ دلی کی بھی انتہا ہے کوئی
جو دل شکن ہے اسی سے ہیں دل لگائے ہوئے

فن ہے اک خوشامد بھی جو تمھیں نہیں آتا
اس طرح تو اے عاقل ، نوکری نہیں ہوتی

یہ مجموعہ شعری اپنے دامن میں بے پناہ لعل و گہر رکھتا ہے اور مطالعے کا متقاضی۔ امید کی جاتی ہے کہ وہ اسی طرح خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رکھیں گے۔ منصور عاقل نے فکر تازہ سے غزل کو تازگی اور جلا بخشی ہے۔ یہ ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

ان کا شعری سفر جاری ہے۔ ابھی اس رگ تاک سے کشید کے لیے منصور عاقل کے

پاس بہت کچھ باقی ہے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارمغاں
ہزار بادہ ناخوردہ در رگ تاک است

اور منصور عاقل کا عزم جواں' حوصلہ بلند ہے۔

عاقل کشید کیجئے ذروں سے آفتاب
ظلمت سے نور' سائے سے تنویر کھینچئے

نشریہ ریڈیو پاکستان اسلام آباد
مورخہ ۲۵ نومبر ۱۹۹۳ء

☆ شریف فاروق

سید منصور عاقل کے کلام اور شخصیت کے چند پہلو

> غزل بڑی نرم و نازک لیکن جاندار اور طرحدار ہے کہ منصور عاقل کے جذبات کی عکاس بن گئی ہے اور شیشہ دل کی نزاکتوں کو برداشت کر لیا ہے۔

سید منصور عاقل سے کہاں اور کن حالات میں ملاقات ہوئی تھی اس کی یاد اب باقی نہیں رہی البتہ اتنا یاد پڑتا ہے کہ وہ محکمہ تعلقات عامہ پنجاب سے وابستہ تھے۔ ملاقاتوں کا سلسلہ چھبیس ستائیس سالوں پر پھیلا ہوا ہے۔ جب بھی ملاقات ہوئی ایک نئے جذبے اور ولولے کو نمایاں پایا۔ اس کی وجہ غالباً" ان کا خاندانی اور علمی پس منظر ہے گفتگو کا محور ذاتی مسائل سے لے کر قومی اور بین الاقوامی' معاشرتی اور سماجی تمام پہلوؤں کو محیط کئے رہا۔

سید منصور عاقل بڑے وضع دار اور گہرے جذبات کے حامل انسان ہیں۔ اگرچہ جسم دوہرا ہے لیکن کردار اکہرا' بے ریا' صاف ستھرا' منافقت یعنی دوہری شخصیت سے مبرا۔ انسان دوست ہیں' مردم گزیدگی سے کوسوں دور' شخصیت کے اکہرے پن کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ ایک ملاقات میں کہنے لگے "میرے لیے میری والدہ کا سب سے بڑا تحفہ میری اہلیہ ہیں"۔ انہوں نے چالیس پینتالیس سالوں پر پھیلے

☆ مدیر مسئول روزنامہ جہاد پشاور

اپنے کلام کو جب زیور طبع سے آراستہ کیا تو اس کا انتساب "اپنی رفیقہ حیات سیدہ ناہید منصور کے نام" ہی کیا۔ کوئی دوسرا شاعر ہوتا تو وہ کہیں کسی خیالی محبوبہ، شکستہ محبت، ٹوٹی ہوئی لحد اور محبوبہ کی قبر کے مرجھائے ہوئے پھولوں کے نام یا خدا جانے کسی موہوم تصور کے تراشیدہ صنم یا اپنی ناکام آرزوؤں کے نام منسوب کر دیتا۔

منصور عاقل کو اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی سے شعر گوئی کا ملکہ "طبعاً" عطا کیا تھا اور ساتویں جماعت ہی سے انہوں نے اشعار کہنے شروع کر دیئے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو اب تک چار پانچ دیوان شائع کرا کے قوم کے علمی خزانے پر احسانات کا بوجھ وارد کر چکا ہوتا لیکن منصور عاقل نے یہاں بھی وضع داری کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ان کے نانا سید عبدالوحید فدا مرحوم اپنے دور کے ممتاز شعراء میں شمار ہوتے تھے بلکہ وہ فصیح الملک داغ دہلوی کے نورتنوں میں تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ جب تک وہ اپنے نانا کا کلام شائع نہیں کر دیتے اس وقت تک وہ اپنا کلام نہیں شائع کرائیں گے۔ یہ مرحلہ اس لحاظ سے بڑا ادق تھا کیونکہ اس کلام کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ سید منصور عاقل نے بڑی عرق ریزی، محنت پسندی اور تحقیق و تجسس سے بکھرے ہوئے کلام کو مرتب کیا۔ اس کلام کی ترتیب و اشاعت اردو شعر و ادب پر بڑے احسان کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لئے کہ حضرت فدا کے کلام کے مطالعہ سے سو سال پہلے کے اردو شعروادب اور علائق معاشرت پر روشنی پڑتی ہے۔ منصور عاقل کا اظہار عقیدت و ادب بڑی وضع داری کا حامل ہے "گہوارہ سخن" میں انہوں نے جہاں محرکات ذہنی کا ذکر کیا وہیں انہوں نے بڑی قطعیت اور صاف دلی کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ "جملہ اصناف سخن میں غزل اور صرف غزل ہی ہمیشہ میری دلچسپی کا موضوع رہی۔ اس کی وجہ تو غالباً" یہ ہو سکتی ہے کہ تمام شعری تاریخ میں جو مقام و مرتبہ اس صنف کو حاصل ہوا ہے وہ کسی دوسری صنف کو نہیں اس کے علاوہ افتاد طبع کو بھی ایک سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ میں اپنی ذات کے حوالے سے یہ بخوبی جانتا ہوں کہ زندگی کا کوئی بھی رخ ہو وہ غزل کے پیکر میں ڈھل کر اس قدر حسین اور دلکش ہو جاتا ہے کہ میرے لئے جمالیات کا اس سے ارفع شعور ممکن نہیں"۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ موقف بھی اختیار کیا ہے "میں نے ہمیشہ ہر ایسی کاوش سے پرہیز برتا ہے جس

کے نتیجہ میں نام نہاد ترقی پسندی کا سہارا لے کر یا جدت و جدیدیت پسندی کے جنوں میں لوگ غزل کے ظاہر ہی کو نہیں باطن کو بھی مسخ کر دیتے ہیں"۔

پرانے زمانے میں اساتذہ نے مصرع اٹھانے والے شاگرد پال رکھے تھے جو مشاعروں میں استاد کے ناقص کلام کا مصرع بھی اس خوبصورتی، خشو و خضوع سے اٹھاتے کہ دنیا عش عش کر اٹھتی اور شمع بصد مشکل ہی دوسرے شاعر تک پہنچنے پاتی کیونکہ مصرع اٹھانے والے بڑے ماہر اور مشاق ہوتے تھے۔

منصور عاقل کے کلام میں نہ تو کہیں وزن گرتا ہے اور نہ ہی انہوں نے جیتے جی کسی شاعر کو وزن گرانے دیا ہے۔ در اصل ان کی ذاتی زندگی بھی بڑی گراں قدر اور ڈیل ڈول کی ہے۔ ان کے افکار و خیالات کی شاعرانہ تجلیات گل و بلبل کی نزاکتوں کو محیط کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ شعر و سخن کی بلندیوں کو چھونے کے لئے صرف بکھرے ہوئے بال، پچکے ہوئے گال، لرزتا جسم، کچیلا بدن، بدبودار منہ، آلودہ ہونٹ یا بیمار دانت اور مدقوق چہرہ ہی ضروری نہیں ہوتا۔ اس لئے جب منصور عاقل خود پابند اوزان قافیہ و ردیف ہیں تو اپنا قافیہ کیسے تنگ اور اپنا وزن کیسے بے وزن کر سکتے ہیں۔ عام طور پر شعراء اپنے کلام کی ترتیب کا آغاز دور اول سے کرتے ہیں لیکن منصور عاقل صاحب نے یہاں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے یعنی اپنے کلام کو ۱۹۴۸ء کی بجائے ۱۹۹۲ء سے شروع کیا ہے۔

۱۹۴۸ء کا زمانہ ان کے جوش جذبات کا زمانہ تھا۔ ان کا تغزل اس عہد میں خوب ابھرتا ہے اور درمیان میں سنجیدہ مراحل بھی آتے ہیں۔ اس میں قومی اور معاشرتی مسائل و مراحل کی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن غزل بہرحال غزل ہے۔ ان کا سارا زور بے چاری غزل پر ہی پڑتا ہے غزل بڑی نرم و نازک لیکن جاندار اور طرحدار ہے کہ منصور عاقل کے جذبات کی عکاس بن گئی ہے اور شیشہ دل کی نزاکتوں کو برداشت کر لیا ہے۔

ایک اور عجیب بات ان کے کلام میں بطور خاص یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ وہ جہاں جہاں بسلسلہ ملازمت رہے اور جن جن واردات قلبی سے دوچار ہوئے انہیں ہر علاقے اور شہر کی مناسبت سے یکجا کر دیا ہے۔ سب سے زیادہ زمین شعر میں انہوں

نے جو گل کھلائے وہ بہاولپور کا شعر ہے۔ غالباً" اہل بہاولپور سرائیکی حوالے سے میٹھے اور مخلص ہوتے ہیں لیکن میانوالی میں جب وہ کالج میں استاد تھے اس وقت بھی خوب شعر کہے۔

میں نے سید منصور عاقل سے پوچھا کہ کیا منصور عاقل مر سکتا ہے وہ تو تختہ دار پر جھول جاتا ہے ہم نے کوئی ایسا عاقل نہیں دیکھا جو منصور بن سکے۔ لیکن یہ شرف بھی منصور عاقل کو حاصل ہوا کہ وہ عاقل ہونے کے ساتھ منصور بھی کہلائے۔ چنانچہ اپنے نام کی توجیہہ کے طور پر انہوں نے مندرجہ ذیل شعر سنایا۔

باچنیں ذوق جنوں پاس گریباں داشتم
درجنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست

اگرچہ سید منصور عاقل نے اپنے کلام کو مختلف مقامات میں قیام کی مناسبت سے مرتب کیا ہے۔ جس کا ذکر آگے آئے گا لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ پشاور کے دوران قیام کو وہ عملاً" فراموش کر بیٹھے ہیں حالانکہ یہ سرزمین اتنی بھی بنجر اور بے آب و گیاہ نہیں تھی اور نہ ہی یہاں جذبات کی شدت میں کمی تھی۔ یہاں کا انسانی اور جغرافیائی حسن جہاں سوز تو بڑے بڑے پتھروں کو پگھلا کر رکھ دیتا ہے۔ اس سرزمین نے فاتحین سے لے کر قلم اور علم دونوں کو بڑی فیاضی سے نوازا ہے۔ اسلام آباد میں منصور عاقل کی شاعری کی جہتیں مارشل لاء سے لے کر قومی انتشار تک پر طعنہ زن ہیں اور ۱۹۶۵ء کی جنگ کے حوالے سے ان کے جذبات ایک سچے پاکستانی کے ہیں۔ در اصل انہوں نے اس موضوع پر جو کچھ کہا خوب کہا ان کی ذاتی زندگی ایک جذباتی پاکستانی کی داستان ہے۔ یہ داستان دراز اور لا متناہی ہے۔ کتنے ہی خم اور کتنی ہی گھاتیں ہیں۔

"اے رب جہاں" کے بعد ان کی پانچ نعتیں۔ سلام۔ قائداعظم اور روح اقبال سے خطاب بالخصوص قابل توجہ ہیں نعتوں میں ان کے جذبہ والہانہ کا چشمہ پورے ولولہ اور دیوانگی سے پھوٹتا ہے۔ میں شاعر نہیں، نقاد نہیں، نثر نگار نہیں لیکن

اچھا شعر، اچھی صورت اور اچھی آواز--- اپنا تقاضہ رکھتے ہیں اس لئے جو لطف اچھے شعر کی لطافتوں میں ہوتا ہے وہ موج مے کی تندی میں بھی دکھائی نہ دیا۔ البتہ ایک روز میں صوبہ سرحد کے کیلی فورنیا کی دلکش وادی میں پھولوں سے اٹی ہوئی ایک روش سے گزر رہا تھا۔ پھولوں کی نازک نازک پتیوں پر کرمزی رنگ اس تناسب سے جلوہ افروز ہو رہا تھا کہ میں وہیں ٹھٹک گیا۔ نرم و نازک پھولوں کی یہ پتیاں قطار اندر قطار آراستہ و پیراستہ گملوں میں اپنا حسن بکھیر رہی تھیں۔ ایسے لگتا تھا پھول کی ہر پتی پر کامل مصور نے کرمزی رنگ کو اس طرح پینٹ کیا ہے کہ کیا مجال ہے ہر پتی کے حسن تناسب میں فرق آجائے۔ شعر بھی تو اسی تناسب حسن کا دوسرا نام ہے اور زندگی کو بھی عناصر میں ظہور ترتیب قرار دیا گیا ہے۔ منصور عاقل کے ہاں تناسب حسن کی لاتعداد مثالیں ملتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

لمحے کبھی جو وصل کے یاد آئے ہیں بہت
قصے تری وفاؤں کے دہرائے ہیں بہت

کرنے کو کر چکے ہیں وہ ترک تعلقات
لیکن سنا ہے بعد میں پچھتائے ہیں بہت

دیکھا کیے ہمیں وہ کنکھیوں سے بار بار
ہم نے نظر ملائی تو شرمائے ہیں بہت

عاقل حوادث غم دوراں بھی کم نہ تھے
دانستہ بھی فریب مگر کھائے ہیں بہت

آنکھوں سے تری یوں تو سبھی مست ہوئے ہیں
کچھ تیر بھی دل میں مرے پیوست ہوئے ہیں

تھی مجھ پہ اچانک جو توجہ تو عجب کیا
برگشتہ و برہم بھی تو یک لخت ہوئے ہیں

اک روشنی سی پھیل گئی کائنات میں
وہ مسکرائے مطلع انوار کی طرح

ایک اور غزل کے چند اشعار مزید ملاحظہ فرمائیے۔

اک دل پہ ناز تھا مگر اے چشم نیم باز
اب دل بھی اعتبار کے قابل نہیں رہا

وہ کیا گئے نگاہ کو ویران کر گئے
محفل میں کوئی رونق محفل نہیں رہا

غالباً" منصور عاقل کا یہ شعر اپنے ملک اور معاشرے کی شدتوں کا بھی مظہر ہو۔ یہ غزل عاقل نے ۱۹۶۹ء میں جب پاکستان دو لخت ہو رہا تھا اس وقت لکھی تھی اور شاعر بے اختیار پکار اٹھا تھا۔

روز روز کے طوفاں آئے دن کے ہنگامے
خود جلا دیا آخر ہم نے آشیاں اپنا

ہم رضا کے بندوں کو زندگی کی کیا حسرت
آؤ یوں بھی کر دیکھو آج امتحاں اپنا

منصور عاقل کا رنگ صحرائی علاقوں میں نکھرتا ہے۔ مثلاً خیرپور، ملتان اور بہاولپور کے زمانے میں کہے گئے اشعار کی نغمگی، جذبات کا خلوص، رومانیت کا نور، احساسات کی گہری کاٹ اور نزاکت تخیلات۔

لاہور کے دوران قیام میں منصور عاقل کا کلام ہلکی ہلکی شوخی و شرارت کا مظہر ہے انہوں نے ایک غزل کی ردیف "آنکھیں" رکھی ہے ہر شعر برجستہ اور بانکپن لیے ہوئے ہے۔ لیکن آنکھوں سے زندہ دلان لاہور کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ ساٹھ ستر سال پہلے ایس پی ایس کے ہال میں جو اب معدوم ہو چکا ہے، زناٹے کے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ مشاعرے میں ایک ہندو شاعر سر پر پگڑی باندھ کر آنکھوں میں کاجل جمائے اور بھاری بھرکم مونچھیں لہراتے ہوئے نمودار ہوئے اور نہایت دبدبے سے غزل کا آغاز کیا۔

میرے محبوب کی کتنی ہیں نشیلی آنکھیں

حاضرین میں طلباء کی بھاری جمعیت موجود تھی۔ اس ہیئت کزائی پر ایک نوجوان نے نعرہ مستانہ بلند کیا۔

نشیلی آنکھیں نہیں مونچھیں

اب شاعر کہتا ہے رسیلی آنکھیں، لڑکے کورس میں گاتے ہیں

رسیلی مونچھیں نشیلی مونچھیں

منصور عاقل کی ایک مرصع غزل ملاحظہ فرمایئے۔

خرد کے تیور نڈھال سے ہیں جنوں کی ہیں بے قرار آنکھیں
عجیب حالت بنی ہوئی ہے ہوئی ہیں جس دن سے چار آنکھیں
رخ حسیں پر مچل رہا ہے شباب و وارفتگی کا عالم
تمام صہبا فروش نظریں تمام بادہ گسار آنکھیں
نظر میں ہے وہ سرور عاقل کہ ہر کوئی مست ہو رہا ہے
شراب تقسیم کر رہی ہیں لٹا رہی ہیں خمار آنکھیں

منصور عاقل کو اللہ تعالیٰ نے جہاں ذاتی کردار کی بلندی عطا کی ہے وہیں انہیں اللہ تعالیٰ نے امانت و دیانت کے جوہر کے ساتھ ساتھ ترنم کی دولت سے بھی نوازا ہے۔ تعجب ہے کہ برادرم قتیل شفائی کو کیا ہو گیا ہے۔ انہوں نے گلے کے نور کی لطافتوں اور شرینیوں سے عوام کو محروم کر دیا۔ اس لحاظ سے منصور عاقل نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اول کلام اس پر آواز کا جادو ماحول کو---- دو آتشہ سہ آتشہ بنا دیتا ہے۔

مطبوعہ ہفت روزہ "فیملی میگزین"
(یکے از مطبوعات نوائے وقت)
۱۹ تا ۲۵ اپریل ۱۹۹۴ء

"بہاولپور میں اردو"
مولفہ مسعود حسن شہاب
شائع کردہ اردو اکیڈمی بہاولپور (۱۹۸۳ء)

منصور عاقل

عاقل جہاں نغزگو شاعر ہیں اور ان میں تخیل کی پرواز اور اسلوب کا نیا ڈھنگ ہے وہاں نثر نگار کی حیثیت سے بھی ان کا ایک منفرد مقام ہے۔

یہ رہنے والے گلاؤٹھی ضلع بلند شہر(یو۔ پی) کے ہیں۔ ان کے بڑے بھائی علامہ قابل گلاؤٹھوی ۱۹۴۹ء مین مستقل رہائش کیلئے بہاولپور میں آئے تھے لیکن وہ خود تو کچھ دن بعد یہاں سے پشاور چلے گئے لیکن منصور عاقل اپنی والدہ اور دوسرے بہن بھائیوں کے ہمراہ یہاں آگئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ملازمت کے بندھن میں پھنسنے تک کئی سال یہیں رہے۔ پھر ملازمت ہی یہاں سے نقل مکانی کا سبب ہوئی۔ لیکن جتنا عرصہ بہاولپور میں رہے یہاں کی ادبی زندگی کے روح و رواں رہے۔ حلقہ ارباب ادب کے وہ بانی رکن تھے۔ نیشنل یوتھ کونسل انہوں نے خود قائم کی اور بہاولپور کی ادبی ومعاشرتی زندگی میں نہایت موثر وفعال کردار ادا کیا ان کی ادبی خدمات میں یہ بات سرفہرست ہے کہ انہوں نے حلقہ ارباب کے تنقیدی اجلاسوں میں باقاعدگی سے شرکت کرکے تنقیدی ادب کو بہاولپور میں فروغ دینے میں سب سے زیادہ حصہ لیا جس کی وجہ سے یہاں نوجوان لکھنے والوں میں ادب کے جدید رجحانات سے استفادہ کا شوق پیدا ہوا اور شاعری کے علاوہ دیگر اصناف ادب میں بھی تخلیقات کا میلان بڑھا خود عاقل جہاں نغزگو شاعر ہیں اور ان میں تخیل کی پرواز اور اسلوب کا نیا ڈھنگ ہے۔

وہاں نثر نگار کی حیثیت سے بھی ان کا ایک منفرد مقام ہے۔ ان کی تحریریں مدلل، وزن دار اور خیال افروز ہوتی ہیں ان کا ابھی کوئی شعری مجموعہ تو منظرعام پر نہیں آیا۔ البتہ ان کے متفرق مضامین کا ایک انتخاب "حرف بحرف" کے نام سے اردو اکیڈمی بہاولپور کی جانب سے چھپ چکا ہے۔ پہلے ان کے کچھ شعری نمونے ملاحظہ ہوں۔

عشق ہی کا غم نکلا اے غم جہاں اپنا — دیکھ پھر نکھر آیا رنگ داستاں اپنا
ہیں وہیں وہیں چرچے آج بھی محبت کے — ذکر چھوڑ آئے ہیں ہم جہاں جہاں اپنا
روز روز کے طوفاں آئے دن کے ہنگامے — خود جلا دیا آخر ہم نے آشیاں اپنا

آتش تصور سے روز وشب سلگتے ہیں — جاں دہکنے لگتی ہے نطق ولب سلگتے ہیں
اک دھواں سا اٹھتا ہے دامن تخیل سے — یاد کے چمن اکثر دل میں جب سلگتے ہیں
دود پرفشاں بن کر کائنات رقصاں ہے — فکر کے الاؤ بھی کیا عجب سلگتے ہیں

جوعشق سے بے خبر گئے ہیں — افسوس تہی نظر گئے ہیں
اشکوں سے کچھ اور تیرے عارض — پھولوں کی طرح نکھر گئے ہیں
موہوم سی اک خلش تھی عاقل — ہم ضبط سے بھی گذر گئے ہیں

اردو نثر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"اردو ادبیات پر ہی موقوف نہیں بلکہ جائزہ لیا جائے تو دنیا کے ہر ادب میں ابتدا" تنقید کسی ایسے بلند مقام پر متمکن نظر نہیں آتی۔ جہاں اس کے سائے ادب کے ایک ایک گوشے تک پہنچ سکتے ہوں یہی وجہ ہے کہ ادبی ارتقاء کی جب تاریخ لکھی گئی تو ہر مورخ نے یہ تسلیم کیا کہ ابتدا" ادب کے بلند واکمل نہ ہونے کے اسباب صرف یہ ہیں کہ شروع میں تنقید کو فن کا درجہ نہیں ملا تھا اور جوں جوں

تنقیدی مذاق میں پختگی پیدا ہوتی گئی اسی قدر ادب کے گیسو بھی سنورتے گئے"
اس سے جہاں منصور عاقل کی طرز نگارش کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ ادب کے ارتقاء میں تنقید کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ اس نقطہ نظر کو انہوں نے بہاولپور کے ادباء اور شعرا میں راسخ کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں اعلیٰ ادبی تخلیقات منظرعام پر آئیں۔

"مشاہیر بہاولپور"
مولفہ مسعود حسن شہاب
شائع کردہ مکتبہ الہام بہاولپور (۱۹۸۱ء)

منصور عاقل بہت اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے ہیں ان کے شعروں میں غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کی گھلاوٹ اور ان کے مضامین میں حسن نگارش کے ساتھ فکر انگیزی اور گہرے مطالعے کی جھلک ملتی ہے۔

سید منصور عاقل! ترقی اور کامیابی صرف خواہش و تمنا پر ہی منحصر نہیں بلکہ لگن اور صلاحیتیں بھی اس کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔

سید منصور عاقل کے خیالات و عزائم دونوں بلند تھے۔ آج سے تیس بتیس سال پہلے جب وہ طالبعلم تھے ان کے دل میں بڑا آدمی بننے کی تمنا انگڑائیاں لیتی تھی اور وہ اسی دھن میں نظر آتے تھے کہ کس طرح ان کے تعلیمی مراحل طے ہوں۔ اور وہ منزل مقصود کو پائیں۔ ابتدا کچھ مالی پریشانیاں سدراہ تھیں لیکن اس سے وہ ہمت نہیں ہارے بی' اے کر کے اسکول ٹیچر بن گئے اور تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اس دوران پہلے انہوں نے پولٹیکل سائنس میں اور پھر تاریخ میں ایم۔ اے کیا اور ٹیچر سے پروفیسر بن گئے اس کے بعد محکمہ اطلاعات میں بطور انفارمیشن افسران کا انتخاب ہو گیا۔ جہاں ڈائریکٹر انفارمیشن تک کے عہدے پر پہنچے' بایں ہمہ خوب سے خوب تر کی جستجو جاری رہی' یہاں تک کہ پاکستان سول سروس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی پھر پاکستان نیشنل سیونگز کے ڈائریکٹر کے عہدے پر ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ آج کل وہ ڈپٹی سیکرٹری اور ڈائریکٹر (آرکائیوز) کے عہدے پر متمکن ہیں اور ان کی ترقی کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔

ان ترقیاتی مراحل میں جس چیز نے مجھے متاثر کیا ہے وہ ان کی سلامت روی مستقل مزاجی اور عادات و خصائل میں یکسانیت ہے طبیعت کا جو انداز پہلے تھا وہ اب بھی ہے' بڑے عہدوں نے ان میں تکبر و غرور پیدا نہیں کیا۔ اپنے ملنے والوں سے میل جول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہی گرمجوشی وہی تپاک اور خلوص و محبت ہے۔

سرکاری ملازمت آدمی کو اچھا خاصا پردیسی بنا دیتی ہے۔ منصور عاقل نے ہندوستان سے ہجرت کے بعد بہاولپور کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ لیکن ملازمت کے ترقی پذیر تغیرات نے انہیں جہانیاں جہاں گشت بنا دیا ہے اور پورا پاکستان ان کی جولا نگاہ بن گیا ہے' آج کل لاہور میں ہیں اور نہیں معلوم کب یہاں سے کہیں اور چلے جائیں۔ اب تو ملازمت کی ذمہ داریوں اور گھربار کی مصروفیات نے ان کے دوسرے مشاغل کم کر دیئے ہیں ورنہ جب تک بہاولپور میں تھے اور پیروں میں ازدواجی زنجیریں نہیں پڑی تھیں ان جیسا سرگرم عمل شاید ہی کوئی اور ہو۔ یہاں کی بیشتر ادبی سماجی اور ثقافتی سرگرمیاں ان کی مرہون منت تھیں' آئے دن مشاعرے ہوتے' مذاکرے ہوتے اور ادبی تقریبات منعقد ہوتیں' حلقہ ارباب ادب جو ۱۹۵۳ء میں قائم ہوا تھا اور جس نے بہاولپور میں ادبی تنقید کے صحت مند رجحانات کو فراغ دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا اس کے فعال ارکان میں منصور عاقل بھی شامل تھے۔ اس حلقے کی دوسری خدمات کے علاوہ بہاولپور میں ایک کل پاکستان اردو کانفرنس کا انعقاد بھی ہے جس میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کے علاوہ بہت سے مشاہیر اہل قلم نے شرکت کی تھی اور اردو کو سرکاری زبان قرار دینے کا پرزور مطالبہ کیا گیا تھا۔

بہاولپور کے نوجوانوں میں قومی شعور بیدار کرنے میں بھی منصور عاقل کا بہت حصہ ہے' انہوں نے ۱۹۵۶ء میں نیشنل یوتھ کونسل کے نام سے نوجوانوں کی ایک تنظیم قائم کی تھی جو علمی و ادبی تقاریب کے علاوہ قومی دلچسپی کے امور پر مذاکروں اور مباحثوں کا اہتمام کرتی تھی۔

منصور عاقل بہت اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے ہیں' ان کے شعروں میں غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کی گھلاوٹ اور ان کے مضامین میں حسن نگارش کے ساتھ فکر

انگیزی اور گہرے مطالعہ کی جھلک ملتی ہے' ان کی ادبی تخلیقات سے اگرچہ اب بہاولپور محروم ہے لیکن اہل بہاولپور پھر بھی یہ فخر کرنے میں حق بجانب ہیں کہ آج جو علاقے ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں وہ دراصل بہاولپور کا ہی صدقہ ہے' کیونکہ "ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اس کا نام" آخر اسی سرزمین نے تو انہیں اور انکی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں سنگ میل کا کام دیا ہے۔

"ضیائے سخن"
مجلّہ خصوصی کسٹمز
پریونٹو سروس کلب، کراچی۔ (۷۴-۱۹۷۳ء)

قطعہ

کراچی میں، جب آپ آئے، تو ذوق علم و فن جاگا
ترستی تھیں نگاہیں، حضرت منصور عاقل کو

زہے قسمت کہ فردوس نظر ہیں حضرت عاقل
طمانیت نہ کیوں حاصل ہو اے راغب مرے دل کو

راغب مراد آبادی

خداحافظی

به ہنگام تبادلہ سید منصور عاقل ازبلدیہ راولپنڈی بکراتشی

سید منصور عاقل، یارما
کاروان و کارواں سالارما

راہ و رسم دوستی زندہ ازو
ہمدمی را شوق پائندہ ازو

لطف میگیرد ازو ذوق سخن
از وجودش پر ضیا ہرانجمن

خوش نگاہے خوش کلامے خوشدلے
عاقل منصور، منصور عاقلے

دوستاں را آیت لطف و کرم
ہر کجا پیدا بہر جا محتشم

می رود از دیدہ ما دور تر
خانہ دلہا بیادش بہرہ ور

بر سردار عقل آمد، طور شد
طرفہ تر ایں عاقلے منصور شد

فیضی و ایوب و اعزاز و رفیق
ہر یک آئین مودت را طریق

اے خوشا ساعت کہ بہر چار یار
بزم ارباب وفا شد استوار

می روی ازما و مارا آرزو
آب رفتہ کاش باز آید بجو

سادہ و دلدادہ و پرکار باش
ہر کجا باشی مقدر یار باش

۱۵ مئی ۱۹۷۳ء

منجانب
سید فیضی۔ ایوب محسن
ڈاکٹر افضل اعزاز۔ ایس۔ ایم۔ رفیق

نذر عقیدت

بخدمت اقدس جناب منصور عاقل صاحب (ایم' اے)
اسسٹنٹ ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات' راولپنڈی۔

اے کہ تو فہم و فراست کا ہے مینار عظیم
تجھ کو فطرت سے ملا ہے ایک کردار عظیم

تیرے چہرے پر حیا کا نور ہے جلوہ فشاں
تیری آنکھوں میں تقدس کی چمک ہے بیکراں

کتنے ہم آہنگ ہیں عاقل ترے قول وعمل
لاکھ ڈھونڈیں پھر بھی مل سکتا نہیں تیرا بدل

شاعر رنگیں نوا ہے تو ادیب بے مثال
ہوشمندی سے مماثل ہے ترا ظرف خیال

تو کبھی ناخوش ہوا ہے اور نہ ہو تنقید سے
کام ہی رکھتا نہیں تائید یا تردید سے

تیرا مسلک ہے محبت اور وطیرہ ہے وفا
جو قدم تو نے اٹھایا وہ قدم تھا کام کا

تیری ہستی ہم فقیروں کو مبارک ہو یہاں
تو چمکتا ہی رہے سب دوستوں کے درمیاں

راولپنڈی (۱۹۷۲ء) قمر صدیقی

"بہاولپور کا شعری ادب"
مرتبہ حیات میرٹھی
شائع کردہ اردو اکیڈمی بہاولپور ۱۹۷۱ء

سید منصور عاقل

سید منصور عاقل قصبہ گلاوٹھی ضلع بلند شہر (یوپی) کے رہنے والے ہیں۔ آپ ہندوستان کے مشہور شاعر حضرت فدا گلاؤٹھوی مرحوم کے نواسے اور علامہ قابل گلاوٹھوی کے بھائی ہیں۔ آپ کے اعزاء آزادی کے بعد پاکستان آئے۔ یہ منصور عاقل کی طالب علمی کا زمانہ تھا۔ آپ نے دیال سنگھ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۵۳ء میں بی اے کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد آپ بہاولپور آگئے اور محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ میں نائب افسر اطلاعات کی جگہ پر ملازم ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد آپ نے حصول تعلیم کے مقصد کے پیش نظر محکمہ تعلیم میں بحیثیت سکول ٹیچر ملازمت اختیار کر لی۔ اور ایس ڈی ہائی سکول بہاولپور میں فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔ ساتھ ہی آپ نے خود بھی حصول علم کا مشغلہ جاری رکھا اور پولیٹیکل سائنس میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد آپ نے تاریخ میں ایم۔ اے کیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر آپ پبلک سروس کمیشن سے منتخب ہو کر انفارمیشن آفیسر کے عہدہ پر محکمہ اطلاعات میں واپس آگئے اور لاہور میں سرکاری فرائض کی بجا آوری میں مصروف ہو گئے۔

بہاولپور کے قیام کے دوران آپ حلقہ ارباب ادب کے سرگرم عمل رکن رہے۔ ۱۹۵۴ء میں کل پاکستان اردو کانفرنس کی انتظامیہ کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے بھی آپ نے مستحسن خدمات انجام دیں۔

کل پاکستان اردو کانفرنس کا یہ سہ روزہ اجلاس۔ ۱-۲-۳ مئی ۱۹۵۴ء کو زیر صدارت بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق (مرحوم) ٹاون ہاول' بہاولپور میں منعقد ہوا تھا۔

منصور عاقل نے ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۷ء تک حلقہ ارباب ادب کی علمی' ادبی اور تنقیدی مجالس میں نہ صرف شرکت کی بلکہ ان مجالس کے انعقاد میں آپ کی کوششوں کو بھی دخل رہا۔ انجمن کاروان ادب کے مشاعروں اور علمی و ادبی محفلوں میں بھی آپ حصہ لیتے رہے۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو کاروان ادب کے زیر اہتمام گورنمنٹ ایس ڈی ہائی سکول کے ہال میں "اردو کلاسیکل شاعری" کے موضوع پر ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی۔ جسکی صدارت علامہ رحمت اللہ ارشد نے کی اور سید ہاشم رضا سید غلام شبیر بخاری۔ پروفیسر اعظم۔ تابش الوری۔ ادیب واثقی۔ امجد قریشی اور سید منصور عاقل نے بحث میں حصہ لیا۔

سید منصور عاقل نے کچھ رفقاء کے ساتھ مل کر اکتوبر ۱۹۵۶ء میں نیشنل یوتھ کونسل کےنام سے ایک سماجی اور ادبی انجمن کی داغ بیل ڈالی اور اس کے صدر منتخب ہو گئے۔ دو ڈھائی سال تک اس انجمن کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ اس کے بعد عاقل صاحب لاہور چلے گئے۔ اور یہ انجمن ختم ہو گئی۔

محکمہ انفارمیشن میں لاہور۔ پشاور۔ خیرپور میرس وغیرہ میں کئی سال تک خدمات انجام دینے اور ترقی یاب ہونے کے بعد عاقل صاحب کو آب ودانہ کی کشش ۱۹۶۶ء میں ایک بار پھر بہاولپور لے آئی۔ لیکن یہاں ان کا قیام چند ماہ سے زیادہ نہ رہا۔ اور اکتوبر ۱۹۶۶ء میں تبدیل ہو کر لاہور چلے گئے۔

عاقل صاحب کا تعلق بحیثیت شاعر و ادیب یہاں کے تمام ادب دوست حضرات کے ساتھ رہا ہے۔ اور ان کی پچھلی یادوں کے نقوش ناقابل فراموش ہیں۔

آپ کی یاد تازہ کرنے کے لیے آپ کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں۔

☆

کعبہ دل اگر اے دوست صنم خانہ بنے
پھر ترا نقش خدا جانے بنے یا نہ بنے

سرخی دل سے ہو عنوان محبت ترتیب
غم اگر ضبط نہ فرمائے تو افسانہ بنے

ہم ہیں وہ رند خرابات کہ اے تشنہ لبی
ابھی چاہیں تو ہر اک گام پہ میخانہ بنے

رسن و دار ہیں خود حسن کا احساس شکست
آگہی جرات رندانہ بنے یا نہ بنے

دل ملا بھی ہمیں عاقل تو طرحدار ملا
ہم بنے بھی تو حریف غم جاناں نہ بنے

☆

روئے نگار صبح کہاں چشم تر کہاں
یہ سب فریب فکر و نظر ہے سحر کہاں

اب تیری جستجو ہے تو اب کس کو ہوش ہے
منزل کہاں قیام کہاں رہگذر کہاں

ہم کو جنوں میں ہوش و خرد پر ہے اختیار
ہر چند بے خبر ہیں مگر بے خبر کہاں

کیا پوچھتے ہو عاقل آشفتہ سر کی بات
اس خانماں خراب کی قسمت میں گھر کہاں

☆

کوئی کس طرح سمجھے اہل دل کی حالت کو
بے خبر سے رہتے ہیں بے سبب سلگتے ہیں

اک دھواں سا اٹھتا ہے دامن تخیل سے
یاد کے چمن اکثر دل میں جب سلگتے ہیں

برق عشق کیا کوندی خرمن دل و جاں پر
اب یہ حال ہے عاقل روز و شب سلگتے ہیں

☆

حوادثات سے الجھی غموں سے ٹکرائی
مرے خیال کی وسعت نظر کی پہنائی

نہ پا سکا کوئی دنیائے آب وگل کا سراغ
ہزار سر پھرے اٹھے ہزار سودائی

مریض ہجر نے دنیا کو خیرباد کہا
فلک پہ چاند ستاروں کی شکل گہنائی

رکھا جو عشق نے آئینہ روبرو عاقل
رخ حبیب سے شرما گئی خود آرائی

☆

ابھی جو قافلہ نوبہار گذرا ہے
بہت طبیعت محزوں پہ بار گذرا ہے

ترے بغیر کبھی آئی ہے بہار تو پھر
ہر ایک پھول کلیجے پہ خار گذرا ہے

وہ جس کو دعوی فرزانگی تھا آج وہی
تلاش یار میں دیوانہ وار گزرا ہے

مہک رہی ہیں ہوائیں دمک رہی ہے فضا
یہ آج کون سر رہگذار گذرا ہے

نہ خلوتوں میں خموشی نہ جلوتوں میں سکوں
عجیب تر دل ہنگامہ کار گذرا ہے

☆

بوتل جو اٹھا لوں میں ابھی دست اثر سے
بادل ابھی گھر آئے ابھی ٹوٹ کے برسے

اے پردہ نشیں ہم نے بہ فیضان تصور
دیکھے ہیں وہ جلوے کہ جو پنہاں تھے نظر سے

وہ ظلمت حالات میں پھر ڈوب گئے ہیں
خورشید جو ابھرے تھے گریبان سحر سے

ہفت روزہ مدینہ
بہاولپور
مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۶۶ء

سید منصور عاقل

عاقل صاحب کا خاندان برصغیر پاک و ہند میں علمی عظمت کا ایک روشن مینار ہے۔ قابل گلاؤٹھوی اس خاندان کی عظمت کے امین ہیں تو منصور عاقل اس کی لاج اور آبرو۔

سید منصور عاقل بہاولپور کے مایہ ناز سپوت ہیں۔ ان کی خداداد صلاحیتوں اور ترقی درجات پر اہالیان بہاولپور فخر کر سکتے ہیں۔ آج سے کم و بیش دس سال پہلے منصور عاقل کچھ بھی نہیں تھے۔ مگر آج وہ سب کچھ ہیں۔ ادیب' شاعر' صحافی نقاد اور بلند کردار افسر۔ انہوں نے اپنی دنیا آپ بنائی ہے۔ اور یہ دنیا درخشاں مستقبل کی حامل ہے۔

عاقل صاحب کی زندگی کا آغاز ایک ایسے باب سے ہوتا ہے جو خشک بھی ہے اور جذب و کشش سے خالی بھی۔ وسائل کی کمی' ذرائع کا فقدان' اور آگے بڑھنے کے لیے سہاروں کا عدم وجود یہ وہ عوامل ہیں جو ان کے راستے کے بھاری پتھر تھے۔ مگر قدرت نے انہیں حوصلہ بخشا تو راستے کا ایک ایک پتھر اپنی جگہ سے کھسک گیا پھر تاریک راستوں میں صلاحیتوں کے چراغ روشن ہو گئے اور مایوسیوں کے افق پر مرادوں کی کہکشاں ابھر آئی۔ عاقل صاحب کا خاندان برصغیر پاک و ہند میں علمی عظمت

کا ایک روشن مینار ہے- قابل گلاوٹھوی اس خاندان کی عظمت کے امین ہیں- تو منصور عاقل اس کی لاج اور آبرو- یہ دونوں بھائی اپنی جگہ ستاروں کا جھرمٹ- گلستانوں کی بہار' آبشاروں کا ترنم' پھولوں کی خوشبو' اور غنچوں کی مہک ہیں- خلوص ان کا خمیر' محبت ان کی ادا' دوستی ان کا شعار عاقل صاحب کبھی بڑے نستعلیق ہوا کرتے تھے- چھریرا جسم اور کونج کی طرح نرم و نازک مگر اب وہ رعنائیاں نہیں رہیں- زندگی کے اس موڑ پر آگئے ہیں- جہاں ذمہ داریوں کا ہجوم اور تفکرات کا اژدھام ہے- ویسے دیکھنے میں بھرپور ہیں- گندمی رنگ' کتابی چہرہ' مسکراتی آنکھیں- صاف ستھرا ذہن- پاکیزہ خیالات اور بلند افکار- گفتار ایسی جیسے میر کی غزل سن لی ہو- مسکراہٹ ایسی جیسے بہاروں میں گل کھلا دیئے ہوں- اور نگاہیں ایسی جیسے افسانے استعاروں میں ڈھل گئے ہوں-

منصور عاقل ہمارے دیرینہ دوست ہیں- وہ جہاں بھی رہے ان کی دوستی ہمارے لئے چاند کی خنک چاندنی کی طرح بے داغ رہی- اس میں نہ بناوٹ تھی' نہ تصنع تھا- نہ کوئی غرض تھی' نہ تمنا----- ہمیشہ ایک خلوص کار فرما رہا- یہی وجہ ہے کہ یہ دوستی ہمیشہ استوار رہی- کوئی اینٹ دوستی کی عمارت سے گری نہیں-

آج عاقل صاحب بہاولپور میں محکمہ اطلاعات کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہو کر آئے ہیں- یہ عہدہ ان کے لئے جلیل القدر اور ہمارے لئے قابل فخر ہے- مگر یہاں بھی ہم انہیں دوست ہی کی حیثیت سے دیکھتے بھالتے ہیں- افسر آتے اور جاتے ہیں- دوستی آنی جانی چیز نہیں ہے- ہماری ان کے ساتھ وہی دیرینہ دوستی ہے جس میں صرف اخلاص کی مہک ہے- وہ یہاں رہیں گے تو یہ مہک قائم رہے گی اور چلے جائیں گے تو بھی وہ دور بیٹھے ہوئے "غزل ہائے روان کا ہمہمہ" محسوس کرتے رہیں گے-

نذر منصور

منصور عجب رنگ ہیں یہ قدر و قضا کے
جاتے ہو چلے حسرت احباب بڑھا کے

دو روز رہا ساتھ مگر کہنا پڑے گا
کچھ طور ابھی باقی ہیں اخلاق و وفا کے

یاد آئے گی وہ صحبت دو روزہ ہمیشہ
یاد آؤ گے منصور مگر ساتھ دعا کے

جس جا بھی رہو فائز و دلشاد رہو تم
اور تم پہ فراواں رہیں انعام خدا کے

ہاں بھولے سے آجائے اگر یاد ہماری
کر لینا ہمیں یاد مگر ساتھ دعا کے

پشاور ۲۱ جنوری ۱۹۶۵ء

شمیم بھیروی

دبستان بہاولپور

مصنفہ : ماجد قریشی (ایم اے)

مطبوعہ : ادارہ مطبوعات آفتاب مشرق بہاولپور (۱۹۶۴ء)

عاقل کی شاعری حسین وجمیل تراکیب بیش بہا استعاروں' خوبصورت کنایوں متنوع خیالات اور مترنم ردیف و قوافی کا ایک ایسا سنگم ہے جس سے ذہن اور فکر محظوظ ہو سکتے ہیں۔

منصور عاقل! عاقل کے ہاں لطافت اور نزاکت سب کچھ ہے اور سیاست کچھ بھی نہیں۔ عاقل کی افتاد طبع سیاسی واقعات اور معاشی بے چینیوں سے بے نیاز ہے۔ مگر یہ بات نہیں کہ اسے زمانے کی متغیر فطرت کا شعور نہیں یا وہ تاریخ کے مادی لوٹ پلٹ سے ناواقف ہے۔ عاقل نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ اسے خوب پرکھا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ جذبات میں بہہ کر ہنگامہ آرائی پر آمادہ نہیں ہوتا اس کا مزاج قدرے مختلف ہے وہ سب کچھ دیکھتا ہے سمجھتا ہے۔ اور شعوری طور پر کبھی حالات سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور کبھی مضطرب مگر دونوں حالتوں میں اس کے جذبات میں شدت پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ ہر اہم سے اہم حادثے کو بڑے سکون سے سنتا ہے اور اسے برداشت کرلیتا ہے۔ اس کے دل میں جذبات کے کتنے ہی طوفان مچلتے ہوں۔ مگر اس کے ہونٹوں پر ایک جانی بوجھی مسکراہٹ کھیلتی رہے گی۔ وہ خوشی میں مچلتا نہیں اور غم میں چلانا گناہ سمجھتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میدانی علاقہ میں بہنے والی ندی کی طرح ہے جس میں نہ تلاطم ہے نہ بھنور بلکہ ایک پرسکون بہاؤ اور ایک مخصوص دل کشی ہے اس اجمال کی تفصیل اس کے ایک شعر میں نظر آتی ہے۔

شرار ہو کے اٹھی، برق بن کے لہرائی
اس اہتمام سے ہم تک نگاہ یار آئی

یوں قافیہ بندی کر لینا آسان بات ہے مگر ایسا شعر کہنا جسے فن شعر میں سہل ممتنع کہا جاتا ہے۔ بڑا مشکل کام ہے۔ نگاہ یار کی شدت اور تیزی کے مضامین اساتذہ سے لے کر تلانذہ تک لاتعداد شعراء نے باندھے ہیں۔ مگر عاقل کی اس قطعی مادی مگر غیر فطری توجیح نے شعر میں ایک ایسا حسن پیدا کر دیا ہے۔ جس کو محض محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ شعر نگاہ یار ہی کی طرح دل میں اتر جاتا ہے اور اسی میں عاقل کی عظمت کا راز پنہاں ہے۔

اس میں تو کلام نہیں کہ عشق
ہی زندگی کی ایک حقیقت نہیں۔ اس سے بھی تلخ تر حقیقتیں ہیں جو انسان سے آگے نہیں بڑھتیں۔عشق کی روحانی عظمت سے شاید بہت ہی کم لوگ انکار کر سکیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عشق ایک ایسا آفاقی اور لافانی جذبہ ہے۔ جو تمام عالم انسانیت میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ عشق کی سحرکاریوں اور بوقلمونیوں کا احساس ایک شاعر یا فنکار کو اور بھی شدید ہوتا ہے۔ اور وہ اس احساس کا اظہار اس کی جملہ شدتوں کے ساتھ اسی قدر خوبی اور دل پذیری سے کر سکتا ہے۔ جس قدر اسے اپنے فن پر قدرت حاصل ہے۔ یہ ہے وہ مرحلہ جہاں ایک فنکار کے لئے جذبہ و تخیل ہی کی صداقتوں کا حامل ہونا ضروری نہیں بلکہ ان کے ادراک کے ساتھ ساتھ فن کی عظمتوں سے ہم آہنگ کرنا بھی اس کا فرض منصبی بن جاتا ہے۔ چنانچہ یہی وہ ایک تصور ہے جس کو لے کر مشرقی شاعروں نے عشق کے موضوع کو اپنایا ہے اور اس میدان میں اپنی شہسواری کے جوہر دکھائے ہیں۔

یہ مضمون ہزار فرسودہ اور پامال سہی مگر اس کے باوجود اس میں تازگی اور شگفتگی ہے۔ رنگا رنگی اور ندرت ہے۔ خلوص کی شیرنی کا رچاؤ ہے۔ اور انسان کی فطرت کے عمیق اور خالص جذبات کی ترجمانی ہے۔

عشق اگر گناہ سے آلودہ نہ ہو تو ایک ایسا پاکیزہ جذبہ ہے کہ جب دل پر

طاری ہو جائے تو پھر ہر منصور کی زبان سے اناالحق جاری ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ازل سے آج تک عشق کا یہ اظہار ہوتا رہا ہے مگر اس کے باوجود اس اظہار بیان سے اکتاہٹ نہیں ہوتی۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے عاقل ایک غزل میں کہتا ہے۔

عشق ہی کا غم نکلا اے غم جہاں اپنا
دیکھ پھر نکھر آیا رنگ داستاں اپنا

خامشی میں ہے پنہاں گریہ محبت بھی
مختلف ہے عالم سے مسلک فغاں اپنا

ہیں وہیں وہیں چرچے آج بھی محبت کے
ذکر چھوڑ آئے ہیں ہم جہاں جہاں اپنا

روز روز کے طوفاں آئے دن کے ہنگامے
خود جلا دیا آخر ہم نے آشیاں اپنا

ہم رضا کے بندوں کو زندگی کی کیا حسرت
آؤ یوں بھی کر دیکھو آج امتحاں اپنا

کون اپنے سر لیتا دو جہاں کے غم عاقل
کام آگیا آخر قلب ناتواں اپنا

عاقل کے کلام میں ایسی بیشمار مثالیں ملتی ہیں جو اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ شاعر کو نہ صرف اظہار خیال پر قدرت حاصل ہے بلکہ ہیئت واسلوب کے معاملہ میں بھی اس کا نقطہ نگاہ نہایت معتبر اور ارتقاء پذیر ہے۔ یہاں یہ بتادینا بھی ضروری ہے کہ عاقل کو مزاجا "غزل سے جو لگاؤ ہے اس نے اسے فکر ونظر کی لطافت بھی عطا کی ہے اور بیان واظہار کی قدرت ودپذیری بھی۔ اصل میں غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جو بے پناہ تخلیقی قوتوں کی طالب ہے اور داخلی وخارجی عوامل کے امتزاج کی حسیں ترین اشکال ہی کی متحمل ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اردو شاعری کی تمام تاریخ میں غزل کو بحیثیت صنف سخن ایک ایسی معراج پر متمکن دیکھتے ہیں جہاں فن شاعری کی تمام تر باریکیوں اور محاسن سخن کی ہزار خوبیوں کے دوش بدوش انسانی جذبات وخیالات کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر پس منظر میں کروٹیں لیتے نظر آتے ہیں۔ ہماری تمام تر شاعری میں صرف غزل ہی ہر بدلتے ہوئے زمانے کی آزمائشوں پر قادر ہے۔ چنانچہ منصور عاقل کی شاعری کا اسی نقطہ نظر سے اگر مزید تجزیہ کیاجائے تو ہمیں سدا بہار جذبات کے شعری مرقعے ملتے ہیں۔ ایک غزل میں وہ یوں نغمہ سرا ہوتا ہے۔

اک ستم اور بھی ہو ترک ستم سے پہلے
چھین لے یا خلش عشق بھی ہم سے پہلے

میں ترے غم کے تصدق مری تقصیر معاف
میں ہی آگاہ نہ تھا عظمت غم سے پہلے

کیف وکم دولت جاں بخش سہی ہم نفسو
روح آزدہ تھی احساس الم سے پہلے

آپ چھیڑیں تو ذرا بربط افسانہ غم
دل اٹڈ آئے گا خود دیدہ نم سے پہلے

منزلیں راہ رواں پر تھیں مقفل گویا
راستے گم تھے ترے نقش قدم سے پہلے

تجھ سے پہلے بھی بہت صورتیں ابھریں دل میں
سیکڑوں بت ہوئے تعمیر حرم سے پہلے

اسی طرح عاقل کی ایک اور غزل زندگی کے تلخ حقائق کی اس طرح ترجمانی کرتی ہے۔

وہ رہ نورد کہ بے نام وبے نشاں گذرے
وہی حیات کی منزل کے راز داں گذرے

شب فراق کی تاریکیاں بھی شاہد ہیں
ہم آنسوؤں میں لئے حسن کہکشاں گذرے

نفس نفس تھا معطر نظر نظر سرشار
مرے قریب سے وہ آج ناگہاں گذرے

تری نظر نے تراشے تھے جو بھی افسانے
وہی حیات کا عنوان داستاں گذرے

اگر مبالغہ پر محمول نہ کیا جائے تو عاقل وہ شاعر ہے۔ جس کے لیے
تلمیذالرحمن کا خطاب بے حد موزوں ہے۔ وہ عام سطح سے بہت بلند ہوکر سوچتا ہے

دل کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوب کر شعر کہتا ہے اور ایسے مقام پر فائز ہے جہاں پہنچ کر غم دوراں بھی غم جاناں کا روپ اختیار کرلیتا ہے۔ عاقل نہ تو ناصح ہے اور نہ قائد وہ صرف شاعر ہے اور اسی پر شاکر بھی ہے۔

عاقل کی شاعری حسین وجمیل تراکیب بیش بہا استعاروں' خوبصورت کنایوں۔ متنوع خیالات اور مترنم ردیف وقوانی کا ایک ایسا سنگم ہے جس سے ذہن اور فکر محفوظ ہوسکتے ہیں۔ غم والم کی تلخی شیرینی میں بدل سکتی ہے اور انسان اپنے آپ میں کھوسکتا ہے۔ اس دعوی کی دلیل میں ایک حسین غزل ملاحظہ ہو۔

آتش تصور سے روز و شب سلگتے ہیں
جاں دھکنے لگتی ہے نطق ولب سلگتے ہیں

رنج بیکراں لے کر رات جب بھی آتی ہے
دل تمام جلتے ہیں سب کے سب سلگتے ہیں

کوئی کس طرح سمجھے اہل دل کی حالت کو
بے خبر سے رہتے ہیں بے سبب سلگتے ہیں

اک دھواں سا اٹھتا ہے دامن تخیل سے
یاد کے چمن اکثردل میں جب سلگتے ہیں

کچھ تو آتش گل بھی وجہ سوز غم ہوگی
ان بھری بہاروں میں ہم جو اب سلگتے ہیں

دود پر فشاں بن کر کائنات رقصاں ہے
فکر کے الاؤ بھی کیا عجب سلگتے ہیں

برق عشق کیا کوندی خرمن دل وجاں پر
اب یہ حال ہے عاقل روز وشب سلگتے ہیں

ہنگامی شاعری کے خالقوں اور آفاقی شاعری کے صنعت گروں میں سے موخرالذکر ہمیشہ نفع میں رہتے ہیں۔ کیونکہ ہنگامی نظمیں اور غزلیں وقت کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت کھوتی جاتی ہیں۔ اور آخر ایک دن ایسا آتا ہے کہ ان نظموں کے پس منظر سے واقف لوگ ناپید ہوجاتے ہیں۔ اور ان فنکاروں کی اہمیت ختم ہوجاتی ہے۔ اس کے برعکس جن شاعروں نے اپنی شاعری کی بنیاد مستقل انسانی جذبات پر رکھی ہے۔ ان کے تمام اشعار زندہ رہتے ہیں اور انسان کے مزاج پر اپنا جداگانہ اثر کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی مختلف ذوق کے افراد بھی ان سے بقدر ظرف خط اٹھاتے ہیں۔ اس طرح یہ شاعر لافانی ہستیوں میں شریک ہوجاتے ہیں عاقل کی ایک غزل ہے۔

سوال ظرف کا ہے ذکر بے خودی تو نہیں
سزائے دار بجرم خود آگہی تو نہیں

سمجھ رہا ہے زمانہ جسے حیات کا غم
تری نگاہ کی اے دوست بے رخی تو نہیں

نہ رسم وراہ محبت نہ ارتباط وخلوص
یہ دوستی کی ہے توہین دوستی تو نہیں

تمہاری زلف معنبر سے نسبتیں ہیں ضرور
شمیم گل کو مجال برابری تو نہیں

نہ جانے کیوں دم رخصت دھڑک رہا ہے دل
کہیں یہ تم سے ملاقات آخری تو نہیں

وہ التفات پہ مجبور ہوگئے ہیں اگر
مری وفا کا ہے اعجاز ساحری تو نہیں

حواس عشق پہ کیوں حیرتی ہے جلوہ گل
خمار آئینہ بردار مے کشی تو نہیں

کسے سنائیں اب احوال بے کسی عاقل
کوئی اس عالم غربت میں دوست بھی تو نہیں

اس غزل میں ندرت فکر، علوخیالی اور بوقلمونی طبع کے جو جوہر نظر آتے ہیں وہ عاقل ہی کا حصہ ہیں۔ عاقل کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ مترنم اور رواں دواں بحور اختیار کرکے بڑے متوازن الفاظ میں نازک اور حسین خیالات پیش کرتا ہے۔ الفاظ میں بھی عاقل بہت محتاط ہے۔ اور وہ اس طرف بہت زیادہ توجہ دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی تراکیب بہت چست اور دل کش ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک اور غزل ملاحظہ ہو۔

جو عشق سے بے خبر گئے ہیں
افسوس تہی نظر گئے ہیں

جذبات کے دم بدم بگولے
پھولوں کو شرار کرگئے ہیں

کتنوں کے اتر گئے ہیں چہرے
گیسو جو کبھی بکھر گئے ہیں

اے دوست بتا کہ تیرے ہوتے
کیوں لوگ یہ دربدر گئے ہیں

ماحول کی یہ ہماہمی کیا
طوفاں سے بھی ہم گذر گئے ہیں

اشکوں سے کچھ اور تیرے عارض
پھولوں کی طرح نکھر گئے ہیں

موہوم سی اک خلش تھی عاقل
ہم ضبط سے بھی گذر گئے ہیں

متناسب الفاظ اور حسین تراکیب سے مزین ایک غزل ملاحظہ ہو۔

حاصل نہیں رہا غم حاصل نہیں رہا
دل کی حکایتیں تو رہیں دل نہیں رہا

ذوق سفر کے ساتھ بڑھا ذوق بیخودی
منزل کا ہوش بھی سر منزل نہیں رہا

وہ کیا گئے نگاہ کو ویران کر گئے
محفل میں کوئی رونق محفل نہیں رہا

اک سیل بے پناہ کی زد پر ہے زندگی
ساحل تو کیا تصورِ ساحل نہیں رہا

اے حسنِ یار بزمِ تصور سے کیا گریز
اب پردۂ نگاہ بھی حائل نہیں رہا

میں جانتا ہوں مجھ میں سلیقہ ہے عشق کا
میں دل کی واردات سے غافل نہیں رہا

ایک اور مترنم غزل ہے۔

غمِ حیات کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں ہم
بدل رہا ہے زمانہ سنبھل رہے ہیں ہم

دمک رہی ہے تجلی سرِ جبینِ سحر
فسونِ ظلمتِ شب سے نکل رہے ہیں ہم

ہمیں جراحتِ منزل رسی کا خوف نہیں
کہ شہرِ گل میں بھی کانٹوں پہ چل رہے ہیں ہم

نواگرانِ جنوں میں تو ہے بھرم اپنا
خرد کی بزم میں گو بے محل رہے ہیں ہم

کسی سے کم نہ رہے ہم بہ فیض وحشت دل
زہے کہ فاتح دشت وجبل رہے ہیں ہم

ہمیں نصیب ہے رعنائی نظر عاقل
کہ صرف بادہ ومحو غزل رہے ہیں ہم

عاقل کی تمام شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ یہ ایک ایسا گلدستہ ہے۔ جس میں رنگ رنگ کے خوشنما اور دیدہ زیب پھول ہیں جن کی مہک روح کو تازگی اور ذہن کو بالیدگی بخشتی ہے اور اس سے تزئین و آرائش کا بھی کام لیا جاسکتا ہے۔

روزنامہ عوام لائلپور
مورخہ ۲۸ جون ۱۹۶۴ء

الوداع۔۔ منصور عاقل

منصور وہ جان بزم احباب
وہ مسلک وفا کا درخوش آب

اخلاص کا پیکر دلاویز
اخلاق کا نیر جہاں تاب

اوصاف جمیل کا صحیفہ
عادات عزیز کا حسیں باب

دانائے رموز عشق و الفت
آگاہ رسوم شوق و آداب

مجموعہ خوبی و فضائل
گنجینہ معنی گہرتاب

ہر لفظ قبول اہل دانش
ہر شعر پہ اہل دل کی ایجاب

ملتی ہے کہاں مثال اس کی
اس جیسے بشر ہیں بلکہ نایاب

منصور یہاں سے جارہا ہے
مغموم و حزیں ہیں سارے احباب

دل ہے کہ لہو اگل رہا ہے
اشک آنکھ میں بن گئے ہیں خوناب

کب دوست کہیں بہم رہے ہیں
ہے بسکہ خلاف چرخ دولاب

منصور! خدا ہے تیرا حافظ
ہمدم ہے دعائے صدق احباب

خلیق قریشی

دبستان بہاولپور
مصنفہ ماجد قریشی (ایم' اے)
مطبوعہ ادارہ مطبوعات آفتاب مشرق بہاولپور (۱۹۶۴ء)

نیشنل یوتھ کونسل ۱۹۵۶ء کے وسط سے لے کر ۱۹۵۸ء کے اختتام تک تقریباً ڈھائی سال سرگرم عمل رہی اس تمام مدت میں سید منصور عاقل اس جماعت کے سربراہ بھی رہے اور روح رواں بھی

نیشنل یوتھ کونسل - ۱۹۵۶ء تک بہاولپور میں ادبی سرگرمیوں نے بہت حد تک ثقافتی اور مجلسی رجحانات کو بھی اپنا لیا- چنانچہ اس دوران بیک وقت دو جماعتیں منظر عام پر آئیں ایک یوتھ مومنٹ اور دوسری بہاولپور ینگ مینز ایسوسی ایشن- ان دونوں جماعتوں نے بھی قومی تقاریب منانے کا سلسلہ شروع کیا اور بعض ثقافتی' مجالس بھی ترتیب دی گئیں- جن کے باعث بہاولپور کے نوجوانوں میں جماعتی حس بیدار ہوئی-

۱۹۵۶ء کے وسط میں نیشنل یوتھ کونسل کے نام سے نوجوانوں کی ایک جماعت معرض وجود میں آئی اس جماعت کے روح و رواں سید منصور عاقل تھے- یہ اول الذکر دونوں تنظیموں سے زیادہ موثر اور نمائندہ ثابت ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ اس جماعت کی داخلی تنظیم مستحکم تھی اور کارکنوں کی ایک بڑی تعداد جماعت میں شریک تھی نیز اس جماعت نے اپنی مطبوعات کا سلسلہ شروع کرکے بڑی حد تک خود کو مالی اعتبار سے خود کفیل بنالیا تھا- دوسری تنظیموں کی طرح اگرچہ نیشنل یوتھ کونسل کا بھی ایک دستور اور ایک منشور تھا- لیکن عملی سرگرمیوں میں یہ جماعت اپنی تمام پیشرو تنظیموں سے سبقت لے گئی-

نیشنل یوتھ کونسل کی بیشتر سرگرمیاں علمی وادبی رہیں- جن میں مباحثوں اور مذاکروں کے انعقاد کے علاوہ تنقیدی محفلیں اور مشاعرے بھی ترتیب دیئے گئے

جن میں بہاولپور کے تقریباً" تمام قابل ذکر ادیب اور شاعر شریک ہوا کرتے تھے۔ قومی تقاریب کا انعقاد بھی نیشنل یوتھ کونسل کی سرگرمیوں کا ایک اہم جزو بن گیا تھا جس کے باعث مقامی سرکاری حلقے قریبی طور پر دلچسپی لیتے رہے۔ کونسل نے دوسال کی مدت میں دو اہم کتابچے بعنوان "قومیت وبین الاقوامیت" اور "جمہوریہ اسلامیہ" شائع کیے۔

اول الذکر کتابچہ ایک مجلس مذاکرہ کی روداد پر مشتمل ہے جس میں سید منصور عاقل، سید شبیر بخاری، علامہ علاوالدین شمس صدیقی اور عبدالغفار خان وغیرہ شریک تھے۔ اس کتابچہ کا قارئین میں ہمت افزاء خیر مقدم کیا گیا۔ جس سے کونسل کے مالیات کا استحکام ممکن ہوسکا۔ دوسرا کتابچہ ۱۹۵۶ء کے آئین کی پہلی سالگرہ پر منعقدہ تقریب کی روئیداد ہے جس میں آئین پر پرمغز اور خیاں افروز تقاریر شامل ہیں۔ مقررین میں سید شبیر بخاری، علاوالدین شمس صدیقی، علی احمد رفعت، سید احمد حسین اور سید منصور عاقل شامل تھے۔ یہ کتابچہ پہلے سے بھی زیادہ پسند کیا گیا اور اس طرح کونسل کی سرگرمیوں کو مزید استحکام واستقامت حاصل ہوئی۔

سابق ایجرٹن کالج کی لائبریری بلڈنگ میں کونسل کا دفتر قائم تھا۔ جہاں ایک باقاعدہ لائبریری اور ایک سماجی بہبود کا مرکز جس میں طبی امداد بھی شامل تھی اور ایک ان ڈور گیمز کلب قائم تھے ہر شعبہ کا ایک سربراہ تھا۔ جو شعبہ کی داخلی تنظیم کا خود ذمہ دار ہوتا تھا۔ اور دیگر جماعتی ہدایات صدر سے حاصل کرتا تھا۔ کونسل کے مقاصد کے تعین اور اس کے دائرہ کار میں ترمیم وتنسیخ کے لیے مجلس عاملہ مجاز تھی۔ لیکن ان تمام فیصلوں کی توثیق جنرل اسمبلی سے کرانا ضروری تھا۔ جو کونسل کے جملہ اراکین پر مشتمل تھی۔ ابتداء میں اراکین کی تعداد بیس اور تیس کے درمیان تھی۔ لیکن ابتدائی دوسال ختم ہونے تک یہ تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی جس میں بہاولپور کے تعلیم یافتہ نوجوان سرکاری افسران اور دیگر مجلسی زندگی سے عملی شغف رکھنے والے حضرات شامل تھے۔

نیشنل یوتھ کونسل ۱۹۵۶ء کے وسط سے لے کر ۱۹۵۸ء کے اختتام تک تقریباً" ڈھائی سال سرگرم عمل رہی اس تمام مدت میں سید منصور عاقل اس جماعت

کے سربراہ بھی رہے اور روح وروان بھی اور حقیقت یہ ہے کہ سید منصور عاقل نے اس علاقہ میں پہلی بار ایک ایسی فعال انجمن قائم کی جو زندگی کے تمام تر شعبوں پر حاوی تھی اور خاص طور پر مجلسی زندگی کو نکھارنے سیاسی شعور پیدا کرنے اور بزم آرائی کا سلیقہ سکھانے میں اس کونسل نے جو اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کا تمام تر کریڈٹ منصور عاقل اور ان کے رفقاء کار کو ملتا ہے۔

یوتھ کونسل کے قابل ذکر بانی اراکین میں سلیم قریشی' حبیب ملک' ابرار محمد عثمانی۔ عبدالروف۔ غلام علی حافظ' نورالدین محمود اور سید محمد رضا نقوی شامل ہیں۔ کونسل کی نائب صدارت کے فرائض ۔ مختلف اوقات میں ڈاکٹر عبدالجلیل سید باقر مہدی اور محمد صادق ضیغم انجام دیتے رہے۔ جنرل سیکرٹری کے منصب پر سلیم قریشی۔ حبیب ملک اور سید احمد حسن مختلف اوقات میں فائز رہے۔ کونسل کے باقی اراکین اور مختلف عہدہ داروں کی جماعت سے مخلصانہ وابستگی اور پیہم کاوش وجانفشانی بہت ہی قابل قدر کہی جاسکتی ہے۔ یہ تمام لوگ ایک خاص جماعتی شعور کے مالک تھے اور جماعتی وابستگی اور خدمت کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ لیکن افسوس کہ سید منصور عاقل کے بہاولپور سے تشریف لے جانے کے بعد انہیں اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ جماعتی تنظیم پر اپنی توجہ صرف کرتے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۵۹ء شروع ہوتے ہی اس عظیم تنظیم کے تار وپود بکھر گئے۔

----

(۱) روزنامہ عوام لائلپور
مورخہ ۲۸ جون ۱۹۶۴ء
(۲) ہفت روزہ مدینہ بہاولپور
مورخہ ۳ جولائی ۱۹۶۴ء
(۳) ہفت روزہ پاکستانی لائلپور
مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۴ء

سید منصور عاقل

لائلپور مغربی پاکستان کے ایک مستعد اور دیانت دار آفیسر کو۔۔ ایک نغزگو اور شائستہ سخن گو کو۔۔ نیک سرشت اور ذہین انسان کو الوداع کہہ رہا ہے۔

لائلپور سے افسر اطلاعات سید منصور عاقل کا تبادلہ پشاور ہوگیا ہے۔ اور ان کے منصب میں ترقی ہوگئی ہے۔ سید منصور عاقل پشاور میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر متعین ہوئے ہیں۔

سید منصور عاقل لائلپور میں ایک اجنبی آفیسر کی حیثیت سے آئے تقریباً" تین سال کے بعد وہ ترقی پا کر جارہے ہیں۔ مگر اب وہ ایک اجنبی آفیسر نہیں۔ بلکہ لائلپور کے علمی وادبی حلقوں کے معروف شاعر۔ تعلیمی اداروں اور درس گاہوں کے مقبول منصف اور مقرر۔ لائلپور کی مجلسی زندگی کے اہم رکن اور سرکاری حلقوں میں یکساں ہردلعزیز ہستی ہیں۔

سرکاری مشینری کے اہم ارکان معین مدت تک مختلف مقامات پر رہتے ہیں اور ان کی خواہش وایما کے ساتھ یا خلاف قواعد کے زیر اثر ان کے تبادلے ہوتے

رہتے ہیں- اور ان کے تبادلے کے موقعہ پر کچھ رسمی یا حقیقی تپاک کا اظہار بھی کیا جاتا ہے- مگر سید منصور عاقل کے تبادلے کا ردعمل ایسا تھا کہ اس پر قطعی رسمیت کی چھاپ نہیں لگ سکتی- بیشمار الوداعی تقریبوں میں سے چند ایک کا ذکر سنئے-

کونسل آف لائلپور ایڈیٹرز کی طرف سے ارم میں عشائیہ دیا گیا- اس کا سب سے نمایاں پہلو یہ تھا کہ اس مختصر مگر منتخب اجتماع میں لائلپور کی مکمل نمائندگی تھی- اسمبلی کے معزز ارکان- بلدیہ کے اعلی نمائندے- وکلاء اور دوسرے حضرات اس میں شامل تھے- ان سب حضرات نے سید منصور عاقل کے حسن اخلاق اور بہترین علمی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کیا-

یونین آف جرنلٹس کی طرف سے پریس کلب میں ظہرانہ دیا گیا- جس میں تمام کارکن صحافی حضرات نے شرکت کی-

جناب غلام حسین شاد اسسٹنٹ ڈائریکٹر اگریکلچر نے اپنے دفتر کے پرفضا لان میں پر تکلف عشائیہ دیا- اس میں اعلی ضلعی حکام- صحافی- شعرا اور ادبا سب شریک تھے- اس موقعہ پر سید منصور عاقل کو قمرلدھیانوی صاحب کا تحریر کردہ منظوم ہدیہ تبریک پیش کیا گیا- جناب حکیم شفائی نے منصور عاقل صاحب کے دوران قیام کی مساعی جمیلہ کا جائزہ پیش کیا- سرکاری وغیرسرکاری حلقوں میں منصور عاقل نے جو قابل تعریف کام کیا ہے- اور حکومت اور عوام کے درمیان اعتماد اور خیر سگالی پیدا کرنے کے لیے انہوں نے جو کچھ کیا ہے- وہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا اسی موقعہ پر شاندار مشاعرہ بھی ہوا-

دانشور احباب نے جناب اشرف گوہر کے یہاں وداعی تقریب کا اہتمام کیا اور نوجوان اہل قلم طبقہ تمام وکمال وہاں موجود تھا-

سید منصور عاقل کے دفتر کی طرف سے جو تقریب منعقد کی گئی اس مین وہ انسانی پہلو زیادہ اجاگر تھا کہ منصور عاقل صاحب اپنے ساتھیوں کے لیے کتنے مشفق تھے اور ان کے ساتھیوں کو اس کا کس قدر احساس ہے-

مجلس اقبال لائلپور کی طرف سے مقامی گورنمنٹ کالج میں ایک مخصوص نشست اسی مقصد کے لیے منعقد کی گئی- پروفیسر افتخار چشتی نے بڑی محبت سے سید

منصور عاقل صاحب کے اس مخلصانہ تعاون کا ذکر کیا جو مجلس اقبال کو عاقل صاحب کی طرف سے حاصل رہا ہے۔ سید کرامت حسین جعفری صدر مجلس اقبال نے فرمایا کہ منصور عاقل کی کمی مجلس اقبال اور دوسری علمی وادبی محفلوں اور تمام کالجوں میں ہر موقعہ پر محسوس کی جائے گی۔ کیونکہ وہ ان تمام اداروں کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔

اس کے بعد کہنے کی بات صرف یہ رہ گئی ہے کہ منصور عاقل نے تقریباً تین سال میں لائلپور میں جس طرح اپنے مخلص حلقہ احباب کو وسیع کیا ہے۔ اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو جس طرح سرکاری حدود اور غیر سرکاری ماحول میں مفید مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے وہ محتاج بیان نہیں پشاور اس اعتبار سے مزید خوش بخت ہے کہ سید منصور عاقل وہاں تشریف لے جا رہے ہیں۔

لائلپور مغربی پاکستان کے ایک مستعد اور دیانتدار آفیسر کو ایک نغزگو اور شائستہ سخن گو نیک سرشت اور ذہین انسان کو الوداع کہہ رہا ہے ہماری بہترین دعائیں سید منصور عاقل کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ملک وملت کی خدمت کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا کرے اور وہ قوم کی متاع گراں بہا ثابت ہوں۔

روزنامہ ملت لائلپور
از سردار عبدالعلیم (مدیر)
مورخہ ۲۴ جون ۱۹۶۴ء

خدمات کا اعتراف

لائلپور میں جب سے انفارمیشن آفس قائم ہوا ہے اس کی مختصر تاریخ کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو سید منصور عاقل کی شخصیت بحیثیت انفارمیشن آفیسر سب سے منفرد دکھائی دیتی ہے۔ اس امر کا اعتراف گذشتہ دن کو دیئے جانے والے عشائیہ میں صحافیوں کی طرف سے کیا گیا جس میں تمام شہریوں۔ معززین۔ حکام اور نمائندگان قوم شامل تھے بیشک سید منصور عاقل کی نہ صرف محکمانہ بلکہ علمی ادبی اور سماجی خدمات یہاں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ آپ نے یہاں نہ صرف صحافیوں کی زندگی کو بہتر بنانے کی سعی کی ہے بلکہ ان کے مقام کو بھی ایک تنظیم میں لاکر بلند کردیا ہے۔ اس سلسلے میں پریس کلب کا قیام ہمیشہ ایک ثبوت کے طور پر اجاگر رہے گا۔

سہ روزہ زم زم بہاولپور
(خاص نمبر)
مورخہ یکم جون ۱۹۵۷ء

منصور عاقل

بہاولپور کا ایک ایسانوجوان کہ جس کی تعلیمی مساعی اور ادبی کاوشیں نوجوانوں کے لیے مشعل راہ بن سکتی ہیں' منصور عاقل میں بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ "سیلف میڈ" ہے۔ اس نے جو کچھ حاصل کیا وہ اسکی اپنی محنت کا نتیجہ ہے اور اب کامیابیاں اس کے قدم چومنے کے لیے بیتاب نظر آتی ہیں بہاولپور میں اس نے اپنی زندگی کا آغاز ایک غیر معروف شاعر سے کیا لیکن اب اس کا نام بہاولپور کے ہر لکھے پڑھے کی زبان پر ہے اسکے پاس یونیورسٹیوں کئی گئی ڈگریاں ہیں۔

منصور بہاولپور کے ادبی حلقوں کی جان ہے کسی بھی ادبی اجلاس میں اس کی نقادانہ تقریر سننے سے تعلق رکھتی ہے وہ بیک وقت شاعر بھی ہے ادیب بھی نیشنل یوتھ کونسل کا صدر بھی ہے۔ اور گورنمنٹ کالج میانوالی کا لیکچرار بھی' وہ السنہ شرقیہ کے لٹریچر پر بھی عبور رکھتا ہے اور انگریزی لٹریچر پر بھی دسترس ہے ان خوبیوں کے ہوتے ہوئے اگر منصور تحدیثاً" نعمتہ اللہ اناالحق" کا نعرہ لگاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے حریفوں کو تلملا جانا چاہیے۔

منصور اچھی سیرت کے ساتھ اچھی صورت کا بھی مالک ہے' گندمی رنگ ستواں ناک موزوں قد' موزوں قامت۔

مرکزی وزیر تعلیم اے ٹی ایم مصطفیٰ کو پریس کلب لائلپور میں خوش آمدید کہتے ہوئے۔
(۱۹۶۳)

خاکہ بعنوان "مینارے"
از ادیب واشمی
مطبوعہ ہفت روزہ الہام بہاولپور
(حلقہ ارباب ادب نمبر)
مورخہ ۷ جون ۱۹۵۵ء

عاقل جہاں زندگی آموز اشعار کا خالق ہے وہاں وہ ایک کامیاب ناقد بھی ہے اس کی تنقیدیں غور و فکر کی حامل ہوتی ہیں۔

اور اب حلقہ کے اس سانولے سلونے فنکار کو میں آپ کے سامنے پیش کروں گا جو عاقل ودانا ہونے کی بنا پر ادب کے بیشتر معرکے جیت چکا ہے۔ عاقل اک باشعور فنکار ہے وہ ماحول کے تقاضوں اور حالات کی رفتار کو بخوبی سمجھتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کے ادب میں زمانے کے ساتھ اک گہرا لگاؤ پایا جاتا ہے۔ جس کی افادیت سے کبھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں یہ بھی کہہ گذروں گا۔ کہ مجھے عاقل کی بیشتر تخلیقات چین کے پہلے عوامی ادیب لوہو سون کی ادبی کاوشوں کی طرح سنجیدہ اور متین نظر آتی ہیں اس نے بھی اپنی کسی تصنیف میں انقلاب کے گیت نہیں گائے اور نہ بغاوتوں کے شرر بار تذکروں سے اپنے قلم کی لطافت کو آشنا کیا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی تمام تر تصانیف کا پس منظر وہ انقلاب رہا ہے جس کی نعمتوں سے آج چین کے کروڑوں افراد بہرہ یاب ہورہے ہیں چنانچہ اسی طرح عاقل کی شاعری اور اسکی تنقیدی تحریروں میں بھی بہت حد تک متذکرہ ادیبہ کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اور اسکی تخلیقی کاوشوں کا مطالعہ کرنے کے بعد صرف یہی

اک رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ یہ سنجیدہ اور متین فنکار بھی اس نظام اور اس نظام حیات کے تنگ و تاریک ماحول سے مطمئن نہیں ہے۔ یہ وہ گہرے اور دیرپا نقوش ہیں۔ جنہیں آسانی سے لوح دل سے محو نہیں کیا جاسکتا اور فن کی عظمت کا احساس یہیں پہنچ کر انسانوں کو ہوا کرتا ہے۔

جو عشق سے بے خبر گئے ہیں
افسوس! تہی نظر گئے ہیں

ماحول کی یہ ہما ہمی کیا
طوفاں سے بھی ہم گذر گئے ہیں

اے دوست بتا کہ تیرے ہوتے
کیوں لوگ یہ در بدر گئے ہیں

مندرجہ بالا شعروں میں معاشرے کے کسی بھی تخلیقی پہلو کی بظاہر نفی نہیں کی گئی ہے۔ لیکن آپ بتائیں ان اشعار کو پڑھنے کے بعد کس قسم کے اثرات دل پر مسلط ہوتے ہیں دنیا میں احتجاج کے دو طریقے ہیں اک تو یہ کہ شاعر الفاظ کے گرم گرم لاوے سے دامن احساس میں آگ بھڑکا دے یا پھر دوسرا طریقہ یہی ہوسکتا ہے کہ جو بھی کچھ کہے وہ اس قدر سنجیدگی کے ساتھ کہے کہ دوسرے اس کے معنوی پس منظر کے بارے میں سوچیں اس کی گہرائی تک اتریں اور پھر کسی انقلاب یا نئی تخلیق کی ضرورت محسوس کرنے لگیں عاقل کے یہاں اک وقار ہے جو اس کے پورے کلام پر محیط نظر آتا ہے اس کی اک مسلسل غزل کے یہ اشعار بھی میری اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

آغاز جوانی کے زمانوں کو بھلا دو
انجام محبت کے فسانوں کو بھلادو

ناواقف دستور محبت تھی جو آواز
اس بانگ تمنا کی زبانوں کو بھلا دو

جو اہل چمن کو تھے گراں بار طبیعت
ان موجب آزار ترانوں کو بھلا دو

عاقل تپش عشق سے گرماؤ لہو کو
نغموں سے گزر جاؤ ترانوں کو بھلادو

عاقل آج کے معاشرہ کا سنجیدہ تر شاعر ہے یہ اور بات ہے کہ اسکی اس سنجیدگی اور سنجیدگی پر مبنی احتجاج کو میں نے ہمیشہ ناپسند کیا ہے لیکن میری یہ رائے اک مخلص دوست ہونے کی حیثیت سے ہے اور وہ اس لیے کہ جب میں سیفٹی ایکٹ کے تحت سنٹرل جیل بہاولپور میں عالم علی خاں عالم کا مہمان تھا تو اس وقت بھی عاقل بڑے سنجیدہ اور پروقار انداز میں احتجاج کررہا تھا۔ ظاہر ہے عاقل اپنے اک دوست کی گرفتاری سے مغموم ہوا ہوگا۔ اور ۱۴ اگست ۵۴ء کو جب ہمارے بیشتر فنکار کھوکھلی مسرتوں کے پرفریب سمندر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ عاقل کی سنجیدہ تر زبان اک باوقار احتجاج میں مصروف تھی۔

کچھ کیف و انبساط کے سانچہ میں ڈھل گئی
کچھ تلخی حیات ہی تیور بدل گئی

اے دوست میری کم طلبی کا نہ رنج کر
یہ اور بات ہے کہ طبیعت بدل گئی

بظاہر یہ غزل کے اشعار ہیں لیکن اس واقعہ کو ظاہر کر دینے کے بعد بھی آپ انہیں صرف غزل کے اشعار سمجھنے پر مجبور رہیں گے؟ اس سلونی رنگت والے فنکار کے سامنے جہاں زندگی ہے اور زندگی کی تلخیاں وہاں اس کی ناقدانہ صلاحیتوں کے سامنے روش وقت کے بے مایہ پرستار بھی رہے ہیں اس لئے اس نے نہایت طنزیہ انداز میں اپنے اس خیال کو اجاگر کیا ہے۔ اور روش وقت کے بے مایہ پرستار کو تنبیہہ بھی کی ہے۔

سن اے روش وقت کے بے مایہ پرستار
تو کچھ بھی نہیں فہم گریزاں سے زیادہ

یہ تو فہم گریزاں والا معاملہ تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی کوئی بھی تحریک اسوقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ روش وقت کے بے مایہ پرستاروں کو یکسر نظرانداز نہ کر دیا جائے۔ عاقل جہاں زندگی آموز اشعار کا خالق ہے وہاں وہ اک کامیاب ناقد بھی ہے اس کی تنقیدیں غور و فکر کی حامل ہوتی ہیں

عاقل کا مذاق تنقید گو بڑی حد تک ناصحانہ ہوتا ہے لیکن جو بھی کچھ وہ پیش کرتا ہے۔ اسے عالم خیال کی بہترین پیداوار کہا جاسکتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی تنقید کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ تنقید کا پہلا حصہ سوالات کے جوابات پر مشتمل ہوتا ہے اور دوسرا حصہ مضمون یا غزل کی قدر و قیمت کے بارے میں اور اس طرح جذباتی طریقے سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ذہنی تنقید کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے اور اس لئے میں کہتا ہوں کہ وہ صحیح معنوں میں ایک نقاد بھی ہے اور شاعر بھی وہ ایک دوست ہے ایک انسان ہے اتنا بڑا انسان جس کے عظیم افلاس کی قسم کھائی جاسکتی ہے مجھے اپنے اس ہم قلم ساتھی پر ناز ہے جو شاعر بھی ہے ناقد بھی ہے اور انسان بھی اور شاید احساس کی یہی وہ قدر مشترک ہے جو ہماری دوستی کا باعث بنی ہوئی ہے۔

"ہفت روزہ انصاف" بہاولپور
مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۵۴ء

منصور عاقل

ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں "منصور" کو "اناالحق" کی صدا بلند کرنے کی پاداش میں دار و رسن کو چومنا پڑے لیکن ابھی وہ زندگی کے ریل پیل میں کچھ عرصہ جینا چاہتا ہے۔ سخن فہم سخن سنج اور سخن شناس ہے۔ سنجیدہ متین اور بردبار۔ شرافت نجابت اور رواداری کا مرقع۔ کم عمر لیکن دل نشین - پیاری ادا اور پیاری وضع - تعریف کی جگہ تعریف اور تنقید کی جگہ تنقید کرتا ہے۔ تنقیص سے کوسوں دور ہے۔ ڈائریکٹر آف انفارمیشن آفس میں معاشرتی زندگی کی گاڑی چلا رہا ہے۔ فائلوں میں غرق ہے لیکن حلقہ احباب وسیع اسے دیکھ کر اقبال کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند